ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

شیما سعدیہ

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی، ۲۰۱۹ء

ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ

مقالہ نگار:

شیما سعدیہ

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اُردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

جولائی، ۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ

پیش کار: شیما سعدیہ رجسٹریشن نمبر: 1317/M/U/S17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز: _____

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمود الحسن رانا: _____

شریک نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان: _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم : _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، شیما سعدیہ حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل اسکالر کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز اور شریک نگران ڈاکٹر محمود الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

شیما سعدیہ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرستِ ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکّر	viii

باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیانِ مسئلہ	۲
iii۔ مقاصد تحقیق	۲
iv۔ تحقیقی سوالات	۲
v۔ نظری دائرہ کار	۳
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۳
vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۴
viii۔ تحدید	۴
ix۔ پس منظری مطالعہ	۴
x۔ تحقیق کی اہمیت	۴
ب۔ ابدال بیلا: اجمالی تعارف	۵

ج۔ مابعد الطبیعیات: نوعیت اور ماہیت

i۔ فلسفہ کیا ہے؟ ۹
ii۔ مابعد الطبیعیات کیا ہے؟ ۱۱
د۔ مابعد الطبیعیات کا تدریجی ارتقا ۱۵
ر۔ مابعد الطبیعیات: تصوف: اساطیر ۲۰
ہ۔ اردو ناول نگاری میں مابعد الطبیعیاتی روایت (منتخب ناولوں کی روشنی میں) ۲۳
حوالہ جات ۳۸

باب دوم: ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں صوفیانہ عناصر

الف۔ محبتِ الٰہی ۴۶
ب۔ مجاز سے حقیقت کا سفر ۵۲
ج۔ مختارِ کل ۵۶
د۔ ورد و ظائف ۶۰
ہ ۔ذات کی نفی ۶۲
و ۔تزکیہ نفس ۶۷
ز۔ خیر و شر کی آویزش ۷۱
ح۔ کشف ۷۲
حوالہ جات ۷۷

باب سوم: ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر

الف۔ اساطیری کردار ۸۵
ب۔ پُراسراریت ۹۴
ج۔ جادو ٹونہ ۱۰۰

د۔ماورائے عقل عناصر ۱۰۲

حوالہ جات ۱۱۰

باب چہارم: ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ ۱۱۳

ب۔ تحقیقی نتائج ۱۱۸

ج۔ سفارشات ۱۱۹

کتابیات ۱۲۰

Abstract

Title: Study and Analysis of Metaphysical Elements in Novel "Darwaza Khulta Hai."

Abstract:

In this research work while analyzing and studying Metaphysical elements, I have focused on some unique features of the Novel such as Mystical, Mythological and Supernatural elements.

My recent thesis comprises of four chapters: the first chapter unfolds an introduction to the research topic and some basic discussions. It is further subdivided into three parts. The first part presents the research topic while the second part writer's brief introduction, brings under discussion the birth of writer, education, professional life and his services being offered in the field of Urdu literature. In the second part, philosophy of Metaphysics and its gradual progression; while in third part, the tradition of Metaphysics in Urdu novel writing are brought under evaluatiom.

The second chapter of the thesis deals with mystic elements present in the novel. After introducing Mysticism and Muslim Mystic, under the head of mystical elements,topics such as Love for Allah, the journey from illusion to reality, Allah Almighty, Warood Wazaif, Self-Negation, Self-Purification,conflict between good and evil and Unvieling of Reality are explained clearly.

The third chapter exposes mythological and Supernatural elements. First of all, myths are explained, then under the head of mythological elements, mythological characters, magic, mystery and supernatural elements are demonstrated in detail.

Fourth and the last chapter consist of overall view, findings and recommendations.

اظہار تشکر

سب سے پہلے میں اللہ اور اس کے محبوب ﷺ کی شکر گزار ہوں جن کی عنایات کے طفیل آج میں اس مقام پر ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی محبت، شفقت اور حوصلہ افزائی کی بدولت میں اپنا تعلیمی سلسلہ آگے بڑھا سکی۔ اپنے بھائی (محمد الیاس) کی شکر گزار ہوں جن کا تعاون اور ساتھ ہمیشہ میرے لیے باعثِ تسکین رہا۔

صدر شعبہ اُردو پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ اور شعبہ اُردو کے تمام اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا تعاون اور علم دوست رویہ دورانِ پڑھائی میرے لیے مددگار ثابت ہوا۔ ڈاکٹر عابد سیال صاحب کی احسان مند ہوں جنہوں نے اپنی لائبریری سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اپنی نگران پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ اور شریک نگران ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کی بالخصوص تہِ دل سے ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی، توجہ اور رہنمائی کی وجہ سے میرا مقالہ بروقت پایہ تکمیل کو پہنچا۔

محسن سلطان صاحب کا از حد شکریہ جنہوں نے مقالے کے عنوان کے انتخاب کے لیے ابدال بیلا کے ناول کی طرف توجہ دلائی۔ ابدال بیلا جیسے شفیق، مہربان اور صوفی منش انسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ نے نہ صرف قدم قدم پر رہنمائی کی بلکہ اپنی ذاتی کتب سے استفادے کا موقع فراہم کیا۔

شکریہ کے اس سلسلے میں سر امجد شیخ کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جن کی علمی معاونت ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ سر صلاح الدین اولکھ کی سپاس گزار ہوں۔ جنہوں نے بے پناہ مصروفیت کے باوجود تحقیقی مقالے کے حوالے سے نہ صرف قیمتی مشوروں سے نوازا بلکہ مواد کی فراہمی بھی یقینی بنائی۔

ہم جماعت ساتھیوں میں سے خاص طور پر سدرہ طاہر کی ممنون ہوں۔ جس نے روزانہ کی بنیاد پر میری ہمت بندھائی۔ پیار اور ڈانٹ ڈپٹ سے مجھے کام مکمل کرنے کی تلقین کرتی رہی۔ اس کے علاوہ ان تمام احباب کی شکر گزار ہوں جنہوں نے کسی بھی حوالے سے میرا ساتھ دیا اور میری مدد کی۔

شیما سعدیہ

باب اوّل:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

(الف) تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

موجودہ تحقیقی مقالے کا عنوان ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے''میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ ہے۔ابدال بیلا اکیسویں صدی کے ناول نگار،افسانہ نگار،ادیب، شاعر اور سیرت نگار ہیں۔آپ تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ابدال بیلا کے نثری فن پارے عصری شعور سے مزین ہیں۔آپ کا اندازِ تحریر منفرد اور مشاہدہ عمیق ہے نیز جزئیات نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔

اردو ناول کا فن ابدال بیلا تک پہنچتے پہنچتے تقریباً ایک صدی سے زائد کا سفر طے کر چکا تھا۔ابدال بیلا نے ناول کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ناول کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔زندگی کے سبھی رنگ ان کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ابدال بیلا حسن، محبت، حقیقت، تاریخ، وطنیت، نفسیات، تہذیب، ثقافت، سماج، تصوف، انسان دوستی، مابعد الطبیعات اور روحانیت کے رنگوں سے زندگی کے کینوس پر خوب صورت تصاویر بناتے ہوئے عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی منزلیں طے کرتے نظر آتے ہیں۔

ii۔ بیانِ مسئلہ:

اردو ادب میں ابدال بیلا: قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کی لڑی کی اہم کڑی ہیں۔اردو ادب کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کرانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔آپ کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے''کا شمار اکیسویں صدی کے ضخیم ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔یہ ناول حقیقت اور فکشن کا حسین امتزاج ہے۔اس ناول میں ناول نگار نے مابعد الطبیعیاتی عمل کے ذریعے تخیلاتی اور ماورائی جہان کی منظر کشی کی ہے۔اس تحقیق کا مقصد ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے''میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ لینا اور اس امر کی نشاندہی کرنا ہے کہ کیسے یہ عناصر انسانی سوچ، فکر، نفسیات اور زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

iii۔ تحقیقی مقاصد:

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

ا۔ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے''میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ لینا

۲۔مابعد الطبیعیاتی عناصر کی ذیل میں صوفیانہ عناصر کا جائزہ لینا

۳۔مابعد الطبیعیاتی عناصر کی ذیل میں اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر کا جائزہ لینا

iv۔ تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیقی موضوع ''دروازہ کھلتا ہے''میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کے جائزہ کے لیے درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے گئے ہیں۔

ا۔ناول ''دروازہ کھلتا ہے''میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ناول ''دروازہ کھلتا ہے''میں کون کون سے صوفیانہ عناصر موجود ہیں؟

۳۔ناول ''دروازہ کھلتا ہے''میں اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر کی نوعیت کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

مجوزہ تحقیقی مقالہ ناول ''دروازہ کھلتا ہے''میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ کے لیے ناول کا بنظرِ عمیق مطالعہ کرتے ہوئے اس میں موجود مابعد الطبیعیاتی عناصر کی ذیل میں آنے والے صوفیانہ، اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر کا جائزہ لینا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیرِ نظر تحقیقی کام کے لیے اپنایا جانے والا طریقہ کار درج ذیل ہے۔

ا۔ زیرِ نظر مقالے میں ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے''پر انحصار کیا جائے گا۔

۲۔ دستاویزی اور بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

۳۔ ابدال بیلا کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے ان کے احباب اور دیگر ادبا سے انٹرویو کو بھی تحقیق کا حصہ بنایا جائے گا۔

۴۔ ناول نگاری کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی شاملِ تحقیق ہے۔ جن میں سے چند کی فہرست ثانوی کتب میں دی گئی ہے۔

۵۔ تحقیقی و تنقیدی کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا جائے گا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

ابدال بیلا کی شخصیت، فن اور افسانہ نگاری کے حوالے سے مقالہ جات تحریر کیے گئے ہیں۔ ناول نگاری کے حوالے سے ''ناول دروازہ کھلتا ہے'' کا کرداری مطالعہ کیا جا چکا ہے۔ تاہم ابھی تک آپ کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں موجود مابعد الطبیعیاتی عناصر کا احاطہ نہیں کیا گیا۔ مجوزہ تحقیق میں آپ کے ناول میں موجود مابعد الطبیعیاتی عناصر کی ذیل میں صوفیانہ، اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان پر تحریر کیے جانے والے مقالہ جات کی تفصیل ذیل میں دی گئی ہے۔

۱۔ میمونہ فاطمہ، ''کرنل ابدال بیلا کی افسانہ نگاری''، مقالہ برائے ایم اے اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء (غیر مطبوعہ)

۲۔ عاصمہ امبر یاسمین، ''ابدال بیلا فن اور شخصیت''، مقالہ برائے ایم فل اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۲۰۰۸ء (غیر مطبوعہ)

۳۔ آصف نذیر، ''کرنل ابدال بیلا کے ناول دروازہ کھلتا ہے کا کرداری مطالعہ''، یونیورسٹی آف لاہور، سرگودھا کیمپس، ۲۰۱۶ء، (غیر مطبوعہ)

۴۔ یاسر عباس، ''ابدال بیلا بحیثیت افسانہ نگار''، سرگودھا یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء (غیر مطبوعہ)

۵۔ سیدہ بشریٰ علی رضوی، ''ابدال بیلا کی رپوتاژ پاکستان کہانی کا فنی اور فکری جائزہ''، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین لاہور، ۲۰۱۸ء (غیر مطبوعہ)

viii۔ تحدید:

ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں تاریخی، سماجی، تہذیبی اور مابعد الطبیعیاتی عناصر پائے جاتے ہیں مگر اس مقالے میں ''دروازہ کھلتا ہے'' میں موجود مابعد الطبیعیاتی عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔ان عناصر کی ذیل میں صوفیانہ، اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کے طور پر اردو ناول میں مابعد الطبیعیاتی رجحانات اور تحقیقی مقالہ جات کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ فلسفہ، مابعد الطبیعیات اور تصوف کی بنیادی کتب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ جن میں کلیمنٹ سی جے ویب کی ''تاریخ فلسفہ''(مترجم: مولوی احسان احمد)، فرید الدین کی ''قدیم ہندوستانی فلسفہ''، ابوالقاسم قشیری کا ''رسالہ قشیریہ''، ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ کی ''تصوف کے مسائل اور مباحث'' وغیرہ جیسی اہم کتب شامل ہیں۔ان کتب کے مطالعے سے مابعد الطبیعیات، فلسفے اور تصوف کی کئی جہات کا جائزہ لینے میں مدد ملے گی۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

روحانیت، تصوف، اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر ہر دور میں ہر تہذیب اور ثقافت کا حصہ رہے ہیں۔مابعد الطبیعیات ان تمام عناصر اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کے دائرہ کار کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔اکیسویں صدی کا انسان مادیت پرستی کا شکار ہو کر لایعنی زندگی گزار رہا ہے۔وہ اپنے افکار، نظریات اور عقائد کے معاملے میں بوکھلاہٹ اور پریشانی کا شکار ہے اور اپنے مسائل کے حل کی راہ تلاش کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ تو کیا مابعد الطبیعیاتی خواص کا حامل یہ فن پارہ عصرِ حاضر کے انسان کی بے چینی، ابتری اور تنہائی کو دور کرنے اور اس کا رشتہ اس کے ماضی، روایت، روحانیت اور تخیلاتی دنیا سے جوڑنے میں کامیاب ہو پایا ہے؟ نیز ابدال بیلا نے کس حد تک کائنات کے پوشیدہ مظاہر کی حقیقت کو دریافت کرنے کی سعی کی ہے۔

(ب)ابدال بیلا: اجمالی تعارف

محمد ابدال بیلا ۱۴؍دسمبر ۱۹۵۶ء کو سیالکوٹ کے محلہ رام طائی میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام چوہدری فضل دین اور والدہ کا نام شریفاں بی بی تھا۔آپ کے ددھیال ہندوستان کے شہر لدھیانہ کے قریب واقع جالندھر کی تحصیل پھلور کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''ماؤمیوال'' کے رہنے والے تھے۔ آپ کے ننھیال کا تعلق بھی لدھیانہ سے تھا جو تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور گوجرانولہ سکونت پذیر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ کے والد فضل دین اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان آ گئے اور سرگودھا کے قریب چک ۷۱ میں رہائش اختیار کی۔ بعد ازاں فضل دین اپنے خاندان کے ہمراہ سیالکوٹ منتقل ہو گئے۔ جہاں محمد ابدال بیلا پیدا ہوئے۔ابدال بیلا کے والد محکمہ پولیس میں ملازم تھے اور پاکستان منتقلی کے بعد وہ پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء کو گوجرانوالہ پولیس لائن سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور آ گئے۔ جہاں انہوں نے ۶؍مارچ ۱۹۸۶ء کو وفات پائی۔آپ کو ''بورے والا'' میں دفن کیا گیا۔ابدال بیلا کی والدہ ''شریفاں بی بی'' نے ۲۶؍دسمبر ۱۹۹۳ء کو وفات پائی۔ انہیں بھی بورے والا میں دفن کیا گیا۔ابدال بیلا نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی سے حاصل کی۔اسی دوران آپ کا خاندان سیالکوٹ سے گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ جہاں آپ نے جماعت سوم سے جماعت نہم تک تعلیم حاصل کی۔۱۹۶۹ء میں آپ کے اہلِ خانہ نے لاہور رہائش اختیار کی۔ جہاں آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی (پری میڈیکل) میں داخلہ لیا۔ بعد ازاں پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد سے ۱۹۷۹ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ تعلیم انہیں مرزا منور حسین اور مشکور حسین یاد جیسے مشفق اور ادب دوست اساتذہ سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا جس سے آپ کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔

میڈیکل کالج فیصل آباد سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں آپ سرگنگا رام ہسپتال لاہور میں بطور ہاؤس سرجن تعینات ہوئے۔ان دنوں ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کے لیے دو سال پاکستان آرمی میں ملازمت کا لازمی قانون تھا۔ چنانچہ اسی سال آپ پاکستان آرمی میں شامل ہو گئے اور بعد ازاں مستقل طور پر پاک آرمی میں خدمات انجام دینے کا فیصلہ کیا۔دورانِ ملازمت پاکستان آرمی اور پاکستان نیوی کا حصہ بن کر پاکستان کے مختلف شہروں میں اپنے فرائض بجالاتے رہے نیز ادب سے محبت کا رشتا بھی ساتھ ساتھ پنپتا رہا۔ ۲۳؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو فُل کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔اس وقت آپ ڈپٹی ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کی

حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۲ء تک پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد میں ڈائریکٹر جنرل رہے۔ ۲۰۱۲ء میں یسریٰ میڈیکل کالج اسلام آباد میں بطور چیف کوآرڈی نیٹر تعینات ہوئے اور ۲۰۱۸ء میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔

ابدال بیلا چھے بھائی تھے۔آپ کے بڑے بھائی اقبال بیلا ۲۰۱۸ء میں دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔آپ کی تین بہنوں میں سے ایک بہن زینت ۱۹۸۳ء میں وفات پا گئیں۔آپ کی اہلیہ سیدہ عفت ڈاکٹری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ قدرت نے آپ کو تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔ بڑے بیٹے حافظ حارث ابدال بیلا ڈاکٹر ہیں اور ہولی فیملی ہسپتال میں بطور سرجن خدمات انجام دے رہے ہیں۔ منجھلے بیٹے نبیل ابدال بیلا پاک فوج میں میجر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ جب کہ چھوٹے بیٹے کیپٹن عمید ابدال بیلا پاک فوج کے عسکری شعبے سے وابستہ ہیں۔ بیٹی لائبہ ابدال بیلا راولپنڈی میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے چوتھے سال میں زیرِ تعلیم ہیں۔آپ سمیت تمام بھائیوں اور اولاد کے نام کے ساتھ اپنے دادا کا نام لگایا گیا ہے۔

ابدال بیلا ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ وہ فطرتاً منکسر المزاج، زندہ دل، حساس، نرم طبیعت اور شائستہ انسان ہیں۔ مضطرب، بے چین اور متجسس طبیعت انہیں کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ان کا عمیق مشاہدہ پرت در پرت انسان کے اندر اور اپنے ارد گرد کے ماحول میں جھانکتا اور کہانیاں تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ابدال بیلا نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی سے کیا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ادبی مجلہ راوی کے نائب مدیر تھے۔آپ کے فنی سفر کا باقاعدہ آغاز کہانی ''گیلی روشنی'' سے ہوا جو ۱۹۷۷ء میں ماہِ نو رسالے میں شائع ہوئی۔ میڈیکل کے آخری سال میں آپ کا افسانوی مجموعہ ''گڈ مڈ'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس کا نام بعد میں بدل کر ''انہونیاں'' رکھ دیا گیا۔آپ کے اس افسانوی شاہکار کو ادب و فن کی دنیا میں جدت پسند روایت کی طرف ایک قدم قرار دیتے ہوئے احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں۔

> ''ادب و فن میں نئے تجربات کے لیے بہت جرات درکار ہوتی ہے اور گڈ مڈ کے افسانوں میں بیلا نے اس حقیقت کے متعدد ثبوت فراہم کیے ہیں کہ ان میں یہ جرات بدرجہ اتم موجود ہے۔'' (۱)

آپ نے بطور سیرت نگار، افسانہ نگار اور ناول نگار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔اس کے علاوہ آپ نے کالم نگاری، شخصیت نگاری، رپورتاژ، سفر نامے اور شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ ابدال بیلا کی ادبی

خدمات کے نتیجے میں انہیں پاکستان میں فیض بک ایوارڈ اور میاں محمد بخش ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جب کہ ۲۰۱۲ء میں ہندوستان نے آپ کو ساحر ایوارڈ اور نشان دوستی ایوارڈ سے نوازا۔ آپ نے لگ بھگ ۲۵ کے قریب تصانیف تخلیق کی ہیں۔ ان کتب کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ سیرت نگاری کے حوالے سے آپ نے ایک کتاب ''آقا ﷺ'' تحریر کی ہے جو نمایاں مقام کی حامل کتاب ہے۔

۲۔ شخصیت نگاری میں ''کبوتر با کبوتر''، ''باز با باز'' اور ''مفتی جی'' شامل ہیں۔

۳۔ آپ نے ایک سفر نامہ تحریر کیا جو ''سورج کے رخ پر'' کے نام سے شائع ہوا۔

۴۔ کالموں کے دو مجموعے ''بین بجاؤ'' اور ''بون سائے'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

۵۔ آپ کی پنجابی شاعری کی کتاب کا نام ''ککراں ہیٹھ کلی'' ہے۔

۶۔ آپ کے نو افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جن میں ''انہونیاں''، ''سن فلاور''، ''عرضی''، ''رنگ پچکاری''، ''زیرِ لبی''، ''لب بستہ''، ''بوندا باندی''، ''بیلا کہانی'' اور ''ابدالیات'' شامل ہیں۔

۷۔ ناولوں میں ''دروازہ کھلتا ہے''، ''ماؤ میوال''، ''سائیں بگو شاہ''، ''دہلی کی ارجمند بانو''، ''تم''، ''جادو نگری''، ''ٹرین ٹو پاکستان'' اور ''پاکستان کہانی'' شامل ہیں۔

گلزار سنگھ پندھیر نے آپ کے ناول ''ماؤ میوال'' کا ''سرہند کنڈے'' کے نام سے گرمکھی زبان میں ترجمہ کیا جو ۲۰۱۴ء میں چندی گڑھ انڈیا سے شائع ہوا۔ مصر قاہرہ سے تعلق رکھنے والی صفیہ صلاح نے عربی زبان میں اور یوسف سندھی نے سندھی زبان میں آپ کی کتاب ''آقا ﷺ'' کا ترجمہ کیا۔ آپ نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران بتایا:

> ''میری چار کتابیں ''بے لاگ''، ''گڈی گڈا''، ''قلو پطرہ'' اور ''حیرت'' زیرِ طبع ہیں۔ نیز ''بندہ'' کے نام سے سوانح عمری ابھی کمپوزنگ کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔''(۲)

ابدال بیلا نے ادب برائے زندگی کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معاشرتی اقدار اور احوال کو اپنی تحریروں کا

موضوع بنایا۔ نثری فن پارے عصری شعور کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔آپ کی کہانیاں بوجھل پن کی قید سے آزاد ہیں۔ تحریر بیانیہ انداز لیے ہوئے ہے۔آپ دلکش اور خوب صورت پیرائے نیز سادہ انداز میں کہانی بُنتے چلے جاتے ہیں۔ جو پڑھنے والے کے دل ودماغ کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ابدال بیلا تو کہانی سنا کر ایک نئی کہانی کی تلاش میں سفر شروع کر دیتے ہیں۔ مگر قاری اس سحر سے خود کو آزاد نہیں کر پاتا اور ابدال بیلا کی بنائی ہوئی اس جادو نگری میں خود کو قید پاتا ہے۔اشفاق احمد ابدال بیلا کے کہانیاں تلاشنے اور انہیں صفحہ قرطاس کی زینت بنانے کے جنون کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''اس وقت کہانی لکھنا تو ایک طرف، کہانی پڑھنا بھی مشقت بلکہ خوامخواہ کی مشقت خیال کیا جانے لگا ہے۔ لیکن اس بڑی اُفتاد کی آبشار کے نیچے کچھ دیوانے ابھی کہانی بننے کے اڈے لگائے بیٹھے ہیں اور اپنی بساط سے بڑھ کر خردہ مال تیار کر رہے ہیں۔ابدال بیلا بھی ایسے ہی دیوانوں میں سے ایک ہیں جو ایک دیوانے پن کے ساتھ کہانی پہ کہانی لکھے جا رہا ہے۔''(۳)

ابدال بیلا کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے''اردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے وجود میں دو صدیوں پر محیط کہانیاں سموئے ہوئے ہے۔اس ناول میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کی کثرت ہے۔اساطیری، مافوق الفطرت اور صوفیانہ عناصر کی مدد سے عشق و محبت کی لازوال کہانیاں اور روحانیت میں ڈوبے کردار قاری کے دل ودماغ کو اپنی گرفت میں لے کر اسے گزرے زمانے کے سفر پر مجبور کر دیتے ہیں۔ قاری شروع سے آخر تک ان کرداروں اور ناول کی سحر انگیز فضا کے اثر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ مشہور ہندوستانی ناول نگار اور افسانہ نگار کیول دھیر نے آپ کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے''کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ کیول دھیر اپنے ایک انٹرویو کے دوران ''دروازہ کھلتا ہے''کو ایک سحر انگیز تحریر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ابدال بیلا کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے''ایک طلسماتی کہانی ہے۔ابدال بیلا کھل جا سم سم کہتا ہے، جادوی نگری کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ قاری کو لے کر ایک طلسماتی دنیا کی طرف نکل پڑتا ہے۔اس طلسماتی دنیا میں دلچسپی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ عشق ، محبت، تصوف، ثقافت، تہذیب، تاریخ، اساطیر غرض کہ ادب کا ہر رنگ پوری آب وتاب کے ساتھ اُس عہد کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔اس ناول میں ابدال کا واسطہ اپنی زندگی سے ہے۔ایسی کہانی جس میں مصنف خود شامل ہو اس کے ساتھ انصاف کرنا نہایت مشکل

ہوتا ہے مگر ابدال نے اس خوب صورتی اور لطافت کے ساتھ خود کو اس ماحول کا حصہ بنایا ہے کہ پڑھنے والا واہ واہ کر اُٹھتا ہے۔ میں نے اس ناول کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ اٹھارہ سو صفحات کو پڑھا، سمجھا اور ان سے لطف اُٹھایا ہے۔ ابدال کا اندازِ تحریر دل کو لبھاتا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ایسے لگتا ہے جیسے آپ اس سے باتیں کر رہے ہوں۔ بلا شبہ ابدال قلم کا جادو گر ہے۔''(۴)

ابدال بیلا کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' اپنے اندر ادب کا ایک جہاں سموئے ہوئے ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔ قاری پر غور و فکر کے در وا کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو خوبصورت انداز میں سامنے لاتا ہے۔ محبت اور امن و آتشی کا درس دیتا ہوا یہ ناول ابدال بیلا کے فن کو یکتائی عطا کرتا اور انہیں ادب کی دنیا میں ایک الگ شناخت دلاتا ہے۔

(ج) مابعد الطبیعیات: نوعیت اور ماہیت

i۔ فلسفہ کیا ہے؟

انسان عقل و شعور کی دولت سے مالا مال ہے۔ جوں جوں انسانی عقل و شعور نے ارتقائی منازل طے کیں۔ اس کی فطرت میں موجود تجسس کے مادے نے مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ چیزوں کے بارے میں عام تصورات کی تشکیل عمل میں آئی۔ فلسفیانہ فکر نے جنم لیا۔ جس کے نتیجے میں کئی سوالات پیدا ہوئے۔ مظاہرِ فطرت اور دیگر تصورات کے در پردہ حقائق کی کھوج اور حقیقت کی جستجو نے ایک نئے علم کو جنم دیا جس کی ابتدا حیرت، استعجاب اور تشکیک سے ہوئی اور اسے فلسفے کا نام دیا گیا۔

''فلسفہ یونانی زبان کے دو لفظوں Philos اور Sophos سے مل کر بنا ہے۔ فلوس کے معنی ہیں دوست اور سوفوس کے معنی ہیں دانش اور سمجھ بوجھ۔''(۵)

فلسفہ ایک وسیع اور ہمہ گیر علم ہے۔ ابھی تک اس کی کوئی جامع اور متفقہ تعریف سامنے نہیں آ سکی۔ اس کی تعریف زمان و مکان کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے۔ ہر فلسفی اپنے ماحول، موروثی اثرات اور لاشعوری رجحانات کے تحت دوسرے فلسفی سے الگ فکر کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ اشیا کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں اس کے بیانات اس کے ذاتی افکار و نظریات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اس اختلاف کا اندازہ فلاسفہ کے مختلف

مکاتب کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ فلسفے کی ساری موشگافیاں انسانی اذہان کا فرضی گمان اور قیاس ہیں جس کی بنیاد شک اور ارتباط پر ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف فلاسفہ نے اپنے اپنے فلسفیانہ نظریات کے مطابق فلسفے کی تعریف کی ہے۔

> ''افلاطون کے نزدیک فلسفہ وجود دایم کا علم ہے۔ ارسطو کے نزدیک وہ اشیا کے اصولوں اور علل کی تحقیق ہے۔ کرسٹیان وولف کے نزدیک وہ تمام ممکنہ اشیا کا علم ہے۔ یہ علم کہ وہ کیوں اور کس طرح ممکن ہیں۔ ونٹ (Wundt) کے نزدیک وہ تجرباتی علوم سے عطا کردہ معلومات کو ایک غیر متناقص نظام میں مربوط کرتا ہے۔''(۶)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ''ادبی اصطلاحات کا تعارف'' میں فلسفے کی تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''وجود، فطرت، سماج، انسان، علم حقیقت اور ان کے باہمی رابطوں کے عمومی قوانین اور اصول و معانی کا مدلل علم ہے۔''(۷)

گویا فلسفیانہ فکر ذات و کائنات کی سچائیوں کی تلاش کرتے ہوئے فکری جمود میں تحرک پیدا کرتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس علم کا دائرہ کار وسیع ہوتا گیا اور اس کے کئی شعبے منظرِ عام پر آئے۔

جدید لغات کے مطابق:

> ''فلسفہ ایک ایسا علم ہے جو خالص عقلی ذرائع سے کام لے کر اس بات کی تحقیق کرتا ہے کہ ا۔ حقیقت (reality) کی ماہیت اور اس کا ڈھانچہ کیا ہے؟ ما بعد الطبیعیات کا شعبہ ۲۔ علم کے ذرائع اور اس کی حدود کیا ہیں؟ نظریہ علم یعنی epistomology کا شعبہ ۳۔ اخلاقی انصاف کے اصول اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اخلاقیات کا شعبہ ۴۔ لغت اور حقیقت کے درمیان کس طرح کا تعلق ہے؟ یعنی sementics کا شعبہ''(۸)

فلسفہ وجود کے کسی خاص پہلو یا جز کے مطالعے کے بجائے خود وجود سے بحث کرتا ہے۔ مثلاً فلسفہ کائنات کو ایک کل کے طور پر لیتا اور اس پر غور و پرداخت کرتا ہے جب کہ اس کے برعکس دوسرے علوم کائنات کے کسی ایک جز یا پہلو کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ دیگر علوم جن خاص اصولوں کو مسلمات قرار دے کر ان کے بارے میں بحث اور غور و فکر غیر ضروری قرار دے دیتے ہیں ان پر غور و فکر کا کام فلسفی سرانجام دیتے ہیں۔

ii۔مابعد الطبیعیات کیا ہے؟

کائنات بظاہر ایک طبعی وجود رکھتی ہے۔مادی وجود کے حامل عناصر کا مطالعہ اور مشاہدہ سائنس کے دائرہ کار میں شامل ہے۔سائنس عالمِ محسوسات کے وجودی حصے کے علم کو مفروضات اور تجربات کی مدد سے جانچتی اور کلیات کی شکل میں سب کے سامنے پیش کرتی ہے۔مگر اس عالمِ شہادت کے آگے کیا ہے اس کے بارے میں کوئی بھی جواب دینے سے قاصر ہے۔ان کلیات کی مدد سے یہ تو ثابت کیا جاسکتا ہے کہ کائنات کا نظام فلاں فلاں قوانین کے تابع ہے مگر فطرت کے یہ قوانین کیسے بن گئے اس کا جواب سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔کائنات کی تشکیل اور قوانین فطرت ہم آہنگ ہیں۔ہر شے ایک با قاعدہ اور منظم طریقے سے اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے افعال اس خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے کہ ذرا برابر بھی کسی نقص کا احتمال نہیں ہے۔ان منظم سرگرمیوں کے اصل محرکات،اسباب اور پس پردہ عوامل کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیں طبیعیات کی دنیا سے مابعد الطبیعیات کی دنیا کا سفر کرنا پڑتا ہے۔گویا طبیعیات موجودات کا علم ہے جو قوانین کے تابع ہے اور مابعد الطبیعیات غیر مادی نوعیت کے مسائل کا بیان،ان کا تجزیہ اور ایک ایسی حقیقت ہے جو قوانین کے تابع نہیں ہے۔نیز یہ ایسا علم ہے جو طبعی وجود سے آگے نظر نہ آنے والے غیر طبعی حقائق کا پتا دیتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کی اصطلاح کیسے وجود میں آئی اس کے بارے میں **شمس الرحمان فاروقی** لکھتے ہیں۔

> ''جب ارسطو کی تصانیف کی فہرست بنائی جانے لگی تو Physics تک تمام تصانیف کے نام درج کیے گئے، پھر باقی کے لیے ایک لفظ استعمال کر لیا گیا Metaphysics یعنی باقی وہ سب جو Physics کے بعد ہے۔ممکن ہے یہ کسی نے اپنی آسانی کے لیے کیا ہو،بہر حال اس فہرست کی بنا پر ارسطو کی وہ تحریریں جن کا تعلق ماورائی موضوعات مثلاً الٰہیات ،عقل،روح ، وغیرہ تھا۔انھیں Metaphysics کہا جانے لگا۔جب مغربی فلسفے کی یہ شاخ اردو میں آئی تو ہم لوگوں نے بھی Metaphysics کا سیدھا سیدھا ترجمہ مابعد الطبیعیات کر دیا۔''(۹)

Meta یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے beyond جب کہ physics کا مطلب ہے Nature۔چنانچہ Metaphysics کے معانی beyond the nature ہوئے۔یعنی فطرت سے پرے،ماورائے فطرت۔وقت کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیاتی نظریات بتدریج ارتقا پذیر ہوتے گئے اور

اس کے معانی میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ مابعد الطبیعیاتی حدود کے تعین کے بارے میں کوئی متفقہ رائے نہیں پیش کی جاسکتی۔ مابعد الطبیعیات کے دائرہ کار کا جائزہ لینے کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ یہ کن عناصر پر مشتمل ہے۔ محمد نوید ازہر اپنے مقالے میں تحریر کرتے ہیں کہ ''مابعد الطبیعیات تین عناصر پر مشتمل ہے۔ وجودیات، کونیات اور نفسیات۔ کچھ فلاسفہ کے نزدیک اس کا ایک عنصر علمیات بھی ہے۔ مگر اسے نفسیات کے تحت ہی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ وجودیات میں ہستی اور وجود نیز وجود کی وحدت اور کثرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کی دوسری شاخ کونیات میں کائنات کے وجود میں آنے کے اسباب و علل اور متعلقات کا جب کہ نفسیات میں انسانوں اور جانداروں کے نفس کی حقیقت اور عمل، انسان، روح، دل، علمیات، حسن، عشق، اخلاقیات (خیر و شر)، اور جبر و قدر جیسے موضوعات کا مطالعہ کی جاتا ہے''[۱۰] مابعد الطبیعیات کے ان عناصر کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ بطور اصطلاح یہ اپنے اندر وسیع معانی سموئے ہوئے ہے۔ اور بطور علم کے ایک شعبے کے اس کی مکمل اور جامع تعریف کرنا قدرے مشکل ہے۔ مختلف لغات، فرہنگ، انسائیکلوپیڈیا، فلاسفہ اور کتابیں مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے مابعد الطبیعات کی تعریف کرتی نظر آتی ہیں۔ کبھی اسے الٰہیات کہا جاتا ہے، کبھی اخلاقیات کو اس کا حصہ بنا دیا جاتا ہے اور کبھی فلسفہ کا ہم معنی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کے حدود کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے لغوی اور اصطلاحی معانی پر غور کیا جائے۔

مابعد الطبیعیات کی مختلف تعریفیں:

نئی اُردو لغت (جامع) کے مطابق:

''مابعد الطبیعیات۔ (ما۔ بع۔ دط۔ طبّی۔ عات) (ع) فطرت سے سوا غیر مادی حقیقت، ماورائی حقیقت''[۱۱]

فرہنگِ عامرہ کے مطابق:

''مابعد الطبیعت۔ سوای طبیعت، علمِ الٰہی''[۱۲]

علمی اردو لغت جامع کے مطابق:

''مابعد الطبیعیات۔ فوق الفطرت، الٰہیات''[۱۳]

قومی انگریزی اردو لغت کے مطابق:

''مابعد الطبیعیات Metaphysics الٰہیات: فلسفے کا وہ شعبہ جو بنیادی اصولوں بشمول وجودیات (علم الوجود)، کونیات (علمِ کائنات)، علمیات (نظریہ علم) پر بحث کرتا ہے۔ فلسفہ خاص طور پر نہایت تخمینی اور باطنی قسم کا فلسفہ''(۱۴)

تشریحی لغت میں مابعد الطبیعیات کے بارے میں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے۔

''ما بعد الطبیعیات۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد الطبیعیات کا وجود تو تصوراتی ہی ہے۔ چنانچہ فلسفہ مابعد الطبیعیات کے حامی فلاسفہ ایسی تصوراتی اشیا کے وجود کے تین زمرے یا انواع بیان کرتے ہیں۔(۱) عالم کائنات میں موجود ٹھوس وجود (اجسام) (۲) اذہان اور اس کی مختلف حالتیں جن کا تصور وقت میں ممکن ہے خلا میں نہیں اور (۳) ''بے وجود اشیا'' جنہیں ہم کائنات کا نام دیتے ہیں۔ یہ اشیا تصوراتی اور بے وجود ہوتی ہیں۔''(۱۵)

A dictionary of philosophy میں مابعد الطبیعیات کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے کہ

"Metaphysics: The original 'meta'-word, derived from the title given to Aristotle's untitled treatise by his first-century editor Andronicus. It means that which comes after 'physics', the latter being the study of nature in general. Thus, the questions of metaphysics arise out of, but go beyond, factual or scientific questions about the world." (۱۶)

Cambridge dictionary میں مابعد الطبیعیات کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے کہ

"The part of philosophy that is about understanding existence and knowledge." (۱۷)

Dictionary.com کے مطابق

"Metaphysics: noun (used with a singular verb)1.The branch of philosophy that treats of first principles, includes ontology and cosmology and is intimately connected with epistimology.2.Philosophy, especially in its more abstruse branches.3.the underlying theoretical principles of a subject or field of inquiry.4. (Initial capital letter, italics) a treatise (4th century b.c) by Aristotle, dealing with first principles, the relation of universals to particulars, the teleological doctrine of causation."(۱۸)

Encyclopedia Britannica میں مابعد الطبیعیات کی تعریف یوں درج ہے کہ

"Metaphysics is the philosophical study whose object is to determine the real nature of things to determine the meaning, structure and princples of whatever is insofar as it is.Although this study is popularity conceived as referring to anything excessively subtle and highly theoretical, and, although it has been subjected to many criticisms. It is presented by metaphysicians as the most fundamental and most comprehensive of inquiries, in as much as it is concerned with reality as a whole." (۱۹)

درج بالا تعریفوں کی روشنی میں ہم کہ سکتے ہیں کہ مابعد الطبیعیات ایک ایسی حقیقت ہے جو حواس کی حدود سے ماورا ہے۔ یہ فلسفے کی شاخ ہے جو وجود کی حقیقت اور مسائل، کائنات کی ابتدا اور ارتقا، زمین پر زندگی کے وجود کی ابتدا، زمان و مکاں کے حقائق، انسانی ذہن، روح اور جسم کے مسائل، وجدان، اخلاقیات، الٰہیات اور تصوف وغیرہ کے موضوعات پر بحث کرتی ہے۔ اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ ہر وہ شے جو غیر مادی اور غیر طبیعی ہے، جس کی ماہیت اور ساخت انسانی حواس کی پہنچ سے دور ہے، جس کا مشاہدہ وجدان کے ذریعے سے کیا جاتا ہے مگر عقل اس کے بارے میں کوئی معقول دلیل اور وضاحت دینے سے قاصر ہے نیز ہر وہ نظریہ اور مفروضہ جس کی تجرباتی طور پر تصدیق یا تردید نہیں کی جاسکتی مابعد الطبیعیات کا حصہ ہے۔

د۔ مابعد الطبیعیات کا تدریجی ارتقا :

زمانہ قدیم کا انسان کائنات اور اس کے مظاہر کو حیرت و استعجاب سے دیکھتا تھا۔ جوں جوں اسے عقل و شعور کی دولت ملی اور اس کی فکر نے ترقی اور ارتقا کی منازل طے کیں تو اس کی فطرت میں موجود تشکک پسندی اور تجسس نے اسے مظاہر کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی۔ یوں انسان نے مظاہر کائنات، انسان، خدا اور کائنات کے مسائل کے بارے میں اپنے علم، مشاہدات، آرا اور نظریات و خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان افکار و خیالات میں تبدیلی بھی آئی، ان کی حمایت و مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں، دلائل دیے گئے، ان کی تعبیر و تشریح کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں اور نئے نظریات سے بھی متعارف کرایا گیا۔ یوں بتدریج انسانی فکر کا فلسفیانہ ارتقا عمل میں آیا۔ فلسفیانہ فکر بہت قدیم ہے۔ جب یونان میں فلسفیانہ فکر کا آغاز ہو رہا تھا اس وقت ہندوستان میں فلسفیانہ فکر چارواک مکتبہ فکر کے بانی کے سُوتروں اور ویدوں کے ذریعے ارتقا کے مراحل طے کر رہی تھی۔ بعد ازاں اسی فلسفیانہ فکر کی ارتقاپذیری کی بدولت ہندوستان میں اپنے عہد کے نامور مابعد الطبیعیاتی فلاسفہ نے جنم لیا۔ ان کا سرسری جائزہ ذیل میں موجود ہے۔

۵۰۰ ق م میں ہندی فلسفہ اُپنشد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اپنشد گروؤں کی اپنے شاگردوں کو دی جانے والی مختلف تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ جس میں برہمہ، تناسخ، کرم اور اخلاقیات وغیرہ کا درس دیا گیا ہے۔ اپنشدوں میں ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح جسم سے نکل کر کسی اور جسم میں حلول کر جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان کو موکش حاصل نہیں ہوتا۔ قدیم ہندی فلسفے میں بھگوت گیتا ایک مقدس مذہبی تصنیف ہے۔ جو عوام الناس تک مخصوص روحانی پیغام پہنچاتی ہے۔ **رائے شیو موہن لعل ماتھر** اپنی

کتاب **''قدیم ہندی فلسفہ''** میں بھگوت گیتا کے بارے میں کہتے ہیں۔

> ''اگرچہ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے مگر اس کے اندر عرفان کا ایک دریا کوزے میں بند ہے۔ توحید کا بلند ترین تصور، روحِ انسانی کا روحِ کل سے واسطہ، زندگی اور موت کا راز، جسم اور روح کا تعلق، علم اور عمل کی باہمی نسبت، جذبات اور عقل کا رشتہ، صلح اور جنگ کا فلسفہ، غرض یہ کہ حیات اور ماورائے حیات کا شاید ہی کوئی اساسی مسئلہ ایسا ہو جو اس کے اندر موجود نہیں۔''(۲۰)

کنفیوشس (۵۵۱ق م۔۴۷۹ق م) چینی فلسفی تھا۔ چینی فلسفے کی نشو و نما میں اس کی تعلیمات کا بڑا حصہ شامل ہے۔ کنفیوشس کا بنیادی فلسفہ ہمدردی، محبت اور خود آگہی ہے۔ اس نظریے کا جوہر انسان سے محبت ہے۔ مہاویر (۵۴۰ق م۔۴۶۸ق م) گوتم بدھ کا ہم عصر اور جین مت کا پیروکار تھا۔ مہاویر کی تعلیمات جین مت کے بنیادی عقائد کی صورت میں سامنے آئی ہیں۔ ان تعلیمات کے مطابق تمام موجودات کی تقسیم دو طرح کی گئی ہے۔ جیو اور اجیو۔ جیو، ذی روح جب کہ اجیو غیر ذی روح کو کہتے ہیں۔ کائنات انہی موجودات پر مشتمل ہے۔ کائنات اور اس میں موجود عناصر ہمیشہ سے تھے انہیں کسی نے تخلیق نہیں کیا نیز جین مت کے پیروکار خدا کے وجود کے سختی سے منکر رہے ہیں۔ ان کے فلسفیانہ تصورات میں اہنسا، تناسخ، موکش، نروان، کیول گیان اور کرم وغیرہ شامل ہیں۔

مہاتما بدھ (۵۶۳ق م۔۴۸۳ق م) نے بدھ مت مذہب کی بنیاد رکھی۔ مہاتما بدھ کا نروان حاصل کرنا مابعد الطبیعیاتی فلسفے کی دین تھا۔ بدھا کا سارا فلسفہ اسی زندگی اور اس کے اخلاقی نتائج پر مشتمل ہے۔ اس کے نزدیک روح جسم کا حصہ ہے اور اس سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ گوتم بدھ کی بنیادی تعلیمات اس فکر کی تابع ہیں کہ

> ''عالم میں جتنی چیزیں ہیں وہ اسباب و علل کے ماتحت آتی ہیں اور ہر چیز ہر لمحہ ایک غیر محسوس اور نامعلوم طریقے پر بدلتی رہتی ہے یعنی ہر شے قانون تغیر و تبدل اور علیت کی تابع ہے۔''(۲۱)

افلاطون (۴۲۸ق م۔۳۴۷ق م) سقراط کا شاگرد تھا۔ افلاطون کا پیش کردہ فلسفہ خیالات منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیاتی بھی ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ جسم میں داخل ہونے سے پہلے انسانی روح

عالمِ خیالات میں ہر شے کا مشاہدہ کر چکی ہے۔ جب روح زمین پر آتی ہے تو اشیا کے بارے میں تصورات اس کے تحت الشعور کا غیر تحریری حصہ بن جاتے ہیں۔ جب انسان کسی شے کو دیکھتا ہے تو عالمِ خیال میں مشاہدہ کی گئی اس شے کی مثال اس کے ذہن میں آجاتی ہے۔ افلاطون کے نزدیک یہ دنیا اصلی دنیا کی نقل ہے نیز اصل دنیا عالمِ خیالات میں موجود اشیا کے تصورات کی دنیا ہے۔

ارسطو (۳۸۴ق م۔ ۳۲۲ق م) یونان کا شہری اور افلاطون کا شاگرد تھا۔ مابعد الطبیعیات کی اصطلاح ارسطو کے مرہونِ منت ہے۔ ارسطو کی مابعد الطبیعات ان اشیا کے بارے میں بات کرتی ہے جو فطرت سے برتر ہیں۔ ارسطو کے نظریات کے مطابق:

> ''خدا کا وجود علتِ اولیٰ سے ماخوذ ہے: کوئی ایک شے ضرور موجود ہو گی۔ جس نے حرکت پیدا کی اور جس کی وجہ سے کائنات اور جملہ اشیا وجود میں آئی ہیں اور یہ ازلی، جوہری اور حقیقی ہو گی۔ مابعد الطبیعیات، میں کہتا ہے، زندگی بھی خدا کی ہے کیونکہ فکر کی زندگی حقیقت ہے اور خدا وہ حقیقت ہے۔ خدا کی خود کفالی زندگی بہترین اور ابدی زندگی ہے۔۔۔ یعنی ایک جوہر ہے جو کہ ازلی اور غیر حرکتی اور حسیاتی اشیا سے جدا ہے۔ جوہر کی کوئی وسعت نہیں اور اس کے کوئی حصے نہیں اور غیر منقسم ہے۔۔۔ یہ ساکن اور غیر متبدل ہے۔''(۲۲)

پاتنجلی (۲۰۰ق م) اور ناگ ارجن (دوسری صدی عیسوی) ہندوستان کے مشہور فلسفی تھے۔ پاتنجلی ''یوگ سوتر'' میں اپنے مابعد الطبیعیاتی نظریات پیش کرتا ہے کہ کُل میں سمانے کے لیے اپنے نفس اور سوچ پر قابو پایا جانا ضروری ہے۔ وسو بندھو (چوتھی صدی عیسوی کا آخر) ہندوستانی مفکر تھا۔ اس نے پرچار کیا کہ معرفت کے ظہور کا مقام شعور ہے نیز خارجی چیزوں کے بارے میں ہماری سوچ ہمارے ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ بھرتری ہری (۴۵۰ء تا ۵۱۹ء) بھی ہندوستانی مفکر تھا۔ اس کی تحریریں اچھوتی فلسفیانہ فکر کی حامل ہیں۔ آپ کی تحریروں کے مجموعے کا نام ''واک پدیا'' ہے۔ واک پدیا کی تعلیمات کے بارے میں ''فلسفیوں کے انسائیکلوپیڈیا'' میں درج ہے کہ

> ''برہمن بے آغاز و بے انجام ہے، جس کا جوہر 'لفظ' ہے۔ 'لفظ' ہی دنیائے مظہر کی علت ہے۔ جس میں سے دنیا ظاہر ہوئی۔ واک پیدیا کا مقصد اس جملے کی تمام فلسفیانہ، لسانی اور

مابعدالطبیعیاتی حوالوں سے تشریح وتوضیح کرنا تھا۔"[۲۳]

شنکر اچاریہ (۷۸۸ء۔۸۲۰ء) ہندوستانی فلسفی اور ماہر الٰہیات تھا۔ شنکر یقین رکھتا تھا کہ برہما ایک ماورائی حقیت ہے، برہما کی حقیقت اسی دنیامیں پاکر جیون مکتی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جسے کاملیت عطاہو جائے وہ آواگون کے چکر سے نکل جاتاہے۔

اسلام میں باقاعدہ فلسفیانہ تصانیف کاآغاز ابویوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی (۸۰۳ءتا۸۷۳ء) سے ہوتاہے۔ الکندی کے نزدیک مابعد الطبیعیات ناقابلِ حرکت اور غیر مادی اشیا کے مطالعے کا نام ہے۔ ہمارے علم کی دو صورتیں ہیں محسوس اور معقول۔ حواس مادی صورت کا ادراک کر سکتے ہیں جب کہ نفس کل یا جنس معقول صورت کا ادراک کرتا ہے۔ الکندی کے بعد جو مسلمان فلسفی سامنے آیا وہ الرازی (۸۶۴ء۔۹۲۴ء) تھا۔الرازی کی ما بعد الطبیعیات کے بنیادی تصورات ان پانچ ابدی اصولوں میں موجود ہیں۔"خالق، روحِ کائنات، زمانہ قدیم کا مادہ، زمان مطلق، مکان مطلق"[۲۴] الفارابی (۸۷۳ء تا ۹۵۰ء) فاراب میں پیدا ہوا۔اس کا زیادہ رجحان تصوف کی طرف تھا۔اس نے دس عقلی نظریہ پیش کیا کہ

> "واحد خدا کی روشنی سے ایک عقل پیدا ہوتی ہے۔ جسے فارابی پہلی عقل قرار دیتا ہے۔ پہلی عقل سے دوسری عقل پیدا ہوتی ہے جو کہ مادی اور ساخت رکھتی ہے جس سے پہلا آسمان یا عرش پیدا ہوا۔ جس کی اپنی روح ہے۔ یوں دوسری عقل سے تیسری عقل اور دوسرا عرش پیدا ہوتے ہوئے معاملہ دسویں عقل تک جا پہنچتا ہے۔ دسویں عقل سے انسانی روح اور چار عناصر پیدا ہوتے ہیں یعنی ہوا، آگ، پانی اور مٹی۔"[۲۵]

ابنِ سینا (۹۸۰ء۔۱۰۳۷ء) بخارا کے قریب پیدا ہوا۔اس نے اپنی فلسفیانہ فکر کا بہت سا حصہ الفارابی سے مستعار لیا اور اس میں نفاست اور نکھار پیدا کیا۔ ابنِ سینا کی ما بعد الطبیعیات کا سب سے بڑا حصہ وجود (being) کے بارے میں ہے۔اس کے مطابق کسی شے کی ماہیت اور جوہر کو اس کے وجود سے الگ شناخت کیا جاسکتا ہے۔

ابنِ رشد (۱۱۲۶ء۔۱۱۹۸ء) نے مابعدالطبیعیاتی سچائیوں کے بیان کے دو طریقے بیان کیے۔ایک فلسفے کے ذریعے جب کہ دوسرا طریقہ مذہب کے ذریعے تھا۔ سینٹ ٹامس آکوینس (۱۲۲۵ء۔۱۲۷۴ء) نے اعلیٰ ترین صداقتیں جن کا تعلق مذہب سے ہے تک رسائی کے لیے مکاشفے کی مدد لینے پر زور دیا۔

ابنِ عربی(۱۱۶۵ء۔۱۲۴۰ء) نے وحدت الوجود کا فلسفہ پیش کیا کہ کائنات رب کی ذات کا پرتو ہے اور خدا کی ذات ہر شے میں موجود ہے۔ جان سکوٹس جو(۱۲۶۶ءتا۱۳۰۸ء) علم الکلام کے سکاٹ ازم نامی مکتبہ فکر کا بانی تھا، نے یہ سوال اُٹھایا کہ کیا انسان بغیر مکاشفہ کی مدد کے خدا کو جان سکتا ہے۔ شیخ سرہندی(۱۵۶۴ء۔۱۶۲۴ء) نے ابنِ عربی کے وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود کا فلسفہ پیش کیا کہ دنیا وجودِ مطلق جیسی نہیں بلکہ اپنی الگ حقیقت رکھتی ہے۔

ایمائل کانٹ(۱۷۲۴ء۔۱۸۰۴ء) نے علم کو تجربی علم اور ماورائی علم میں منقسم کیا۔ تجربی علم کو حواس اور تجربے کے ذریعے پرکھا جب کہ ماورائی علم کو حواس کے ذریعے نہیں پرکھا جا سکتا اور نہ ہی اس کا کوئی ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ ''The phenomenology of mind/ spirit''فلسفے پر ہیگل(۱۷۷۰ء۔۱۸۳۱ء) کی اہم کتاب ہے۔ ہیگل کا جدلیاتی فلسفہ تاریخ کا فلسفہ ہونے کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعات کا نظام بھی ہے۔

سورین ایبے کیگارڈ(۱۸۱۳ء۔۱۸۵۵ء) نے اپنے فلسفے میں فرد کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کا شمار وجودیت کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ نطشے(۱۸۴۴ء۔۱۹۰۰ء) جرمن فلاسفر تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں ایک ایسے انسان کا تصور پیش کیا جو کہ فوق البشر ہے۔ راہبانہ اخلاقیات کی پیش کردہ اعلیٰ ترین اقدار کی بے قدری کے بیان کے لیے اس نے ''Nihilism'' کی اصطلاح استعمال کی۔ ہنری برگساں(۱۸۵۹ء۔۱۹۴۱ء) کا شمار ارتقا پسند مفکرین میں ہوتا ہے۔ برگساں نے بتایا کہ

> ''زندگی عمومی صورت اور انفرادی شعور میں بھی ایک ہی جیسے اوصاف کی مالک ہے، بلارکاوٹ متواتر بہاؤ جو پائیدار ہے اور جس کا جوہر زماں ہے۔ زندگی کی دونوں صورتوں کی تہہ میں قوت حیات کی زبردست تحریک کار فرما ہے۔ یہی ''تخلیقی ارتقا'' انواع کے آغاز اور ترقی کے لیے حتمی ذمہ دار ہے۔ اس عظیم تاریخی ایڈونچر کے راز کو وجدان کے ذریعے کھوجا جا سکتا ہے۔ وجدان عام طور پر ہمارے اندر محوِ خواب رہتا ہے جسے جگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔''(۲۶)

مارٹن ہیڈگر(۱۸۸۹ء۔۱۹۷۶ء) ایک وجودیت پسند تھا۔ اپنی کتاب ''Being and Time'' میں وہ انسان کے ہونے اور اس کی ہستی کی کھوج کے متعلق سوال اُٹھاتا ہے۔ محمد اقبال(۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کا فلسفہ مابعد الطبیعیات ان کی شاعری کا نمایاں جزو ہے۔ ان کے فلسفہ خودی اور فلسفہ مردِ مومن میں مابعد الطبیعیاتی

جہات واضح ہیں۔ البیر کامیو (۱۹۱۳ء۔ ۱۹۶۰ء) نے اپنی تحریروں میں انسان کی لغویت، تنہائی اور دنیا میں بیگانگی کے احساس کو بیان کیا۔ اکیسوی صدی کا ایک اہم مسئلہ انسان کی لایعنی زندگی اور تنہائی کا احساس ہے۔ جس کا عکس اس عہد کے کئی فلاسفہ کے افکار میں نظر آتا ہے۔

مابعد الطبیعیاتی ارتقا کی روایت کا مختصر جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے مظاہر فطرت کی پُراسراریت سے متاثر ہو کر سچائی کی دریافت کا سفر شروع کیا۔ کائنات کیسے، کیوں اور کن عناصر کی مدد سے وجود میں آئی، کیا کائنات مستقل تغیر پذیر ہے، انسان کی حقیقت کیا ہے، روح اور جسم کا آپس میں کیا تعلق ہے، روح کی نوعت اور ماہیت کیا ہے، حیات اور ماورائے حیات مسائل کیا ہیں، حقیقتِ مطلق کیا ہے، موجودات کی کتنی اقسام ہیں، عقل اور وجدان کے تضادات کیا ہیں، وغیرہ جیسے سوالات کی تفہیم مختلف فلاسفہ نے اپنے فہم کے مطابق کی۔ شے سے لاشے، مادی سے غیر مادی، موجود سے لاموجود، طبعی سے غیر طبعی اور کثیف سے لطیف کے اس سفر میں انسان اپنے وجود کی پُراسرار ماہیت کی کھوج کی طرف نکلا تو نفس اور آفاق جیسی اصطلاحات وجود میں آئیں اور اس پر ذات اور کائنات کے حوالے سے کئی بھید منکشف ہوئے۔ حقیقت شناسی کا یہ جنون اسے کثرت میں وحدت کی تلاش میں اپنی صلاحیتوں کے استعمال پر مجبور کرتا ہے۔ تبدیلی اور تحرک کے مظاہر اسے یہ جاننے پر اُکساتے ہیں کہ ان تغیرات اور تحرکات کا مخفی محرک کیا ہے۔ علم اور فن کے مختلف شعبے اسی تجسس اور ذوق کے تسلسل کی بدولت وجود میں آئے۔ مختلف مکاتب، فکری رویے، مسالک، مذاہب اور نظریات اسی جستجو اور شوق کے تسلسل کی پیداوار ہیں۔ اسی لگن اور اصلیت کی تلاش نے کئی مفروضوں کو حقیقت اور کئی حقائق کو مفروضوں میں تبدیل کر دیا۔ کوئی بھی سچائی قطعی، حتمی اور انتہائی نہیں ہے۔ ہر دور کی اپنی جزوی سچائیاں ہیں، جن کی تلاش میں اس دور کا انسان سرگرداں ہے۔ جمود مخالف قوتیں، تحقیق اور تجسس کے ذوق کو جلا دیتی ہیں اور عقل اور وجدان کائنات میں ہونے والی پُراسرار تبدیلیوں کے جاری و ساری لامتناہی سلسلے کے محرکات کی دریافت کی سعی میں ہے۔ گویا جب تک نفس اور آفاق کا وجود ہے، کائنات سے کن فیکون کی صدا بلند ہو رہی ہے، انسان کے ساتھ اس کے عہد کی سچائیاں تبدیل ہو رہی ہیں اس وقت تک فلسفیانہ ارتقا کا یہ عمل جاری ہے۔

ر۔ مابعد الطبیعیات: تصوف: اساطیر

مابعد الطبیعیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جو اشیا کی حتمی حقیقت اور وجود کے بارے میں سوال اُٹھاتی اور بحث کرتی ہے۔ ابتدا میں مابعد الطبیعیاتی علم کا دائرہ کار محدود تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ کار

وسعت اختیار کرتا گیا۔ وجود کی حقیقت ، کائنات کی ابتدا اور زمان و مکان کی آفاقی سچائیوں سے شروع ہونے والا سفر اپنے دامن میں نفسیات، الٰہیات ، تصوف اور اساطیر جیسے فلسفیانہ موضوعات کو سمیٹ کر ایک ایسے راستے پر رواں دواں ہے جس کی حتمی منزل کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ گو مابعد الطبیعیات اور ان فلسفیانہ افکار کے کچھ پہلو آپس میں مشاہداتی، تجرباتی، معروضی اور موضوعی لحاظ سے اختلاف کے حامل بھی ہیں مگر کئی لحاظ سے ان میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ تصوف اور مابعد الطبیعیات کے تعلق کے حوالے سے محمد نوید اظہر اپنے مقالے میں بیان کرتے ہیں کہ

> ''تصوف اور مابعد الطبیعیات کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ تصوف میں بھی ایسے مابعد الطبیعیاتی مسائل، واقعات اور سوالات ملتے ہیں جن کا شعوری اور حسی ادراک دشوار ہے۔ کیونکہ مابعد الطبیعیاتی افکار کی تفہیم میں حسیاتی اور تجربی علم کسی صورت مددگار ثابت نہیں ہوتا اس لیے اس کے موضوعات کا دائرہ کار بھی یکسر الگ ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کے معنی ماورائے فطرت اور فوق الفطرت ہیں اسی طرح تصوف کے مراحل میں پیش آنے والی وارداتِ قلبی، کشف و کرامات اور روحانی تجربے ماورائے فطرت ہوتے ہیں۔ جو عقل و شعور کی حدود سے بالاتر ہیں۔''(۲۷)

گویا تصوف کا موضوع مابعد الطبیعیات کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ تصوف اور مابعد الطبیعیاتی فکر کے کئی پہلو آپس میں مماثلت رکھتے ہیں اور کئی حوالوں سے یہ فکر جداگانہ حیثیت کی حامل بھی ہے۔ تصوف مابعد الطبیعیاتی علم کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ وجدان کے ذریعے حاصل ہونے والا روحانی علم ہے۔ جو مراقبے اور مجاہدے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ مابعد الطبیعیات ایک مختلف طریقہ کار کا حامل فلسفہ ہے۔ جہاں ممکنات کا علم حاصل کرنے کے لیے منطق، استدلال اور مشاہداتی تجربات جیسے طریقے سے باقاعدہ مدد لی جاتی ہے۔ تصوف اور مابعد الطبیعیات استدلال اور اپنے مقاصد کے حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یعنی تصوف کا علم دنیا کے شخصی تجربے پر مرکوز ہے جب کہ مابعد الطبیعیات کا تعلق وجودیاتی معروضی علم کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر طاہر حمید تصوف اور مابعد الطبیعیات کے حوالے سے کہتے ہیں۔

> ''جدید سائنسی تحقیقات اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ تصوف انفس و آفاق میں وحدت کی تلاش کا ایسا ذریعہ ہے جو انسان کو انجام کار خالقِ حقیقی کے عرفان اور اس سے ایسے ابدی تعلق سے بہرہ ور کرتا ہے جو قرآن حکیم کے الفاظ میں فوز عظیم ہے۔ قرآن حکیم فطرت

کے انہی بنیادی حقائق جن کا انکشاف آج کی ایٹمی فزکس کر رہی ہے کو بیان کر کے قربتِ الٰہی کے تصور کی اہمیت قلب و روح میں جاگزیں کرواتا ہے۔"(۲۸)

یہ دونوں فلسفے کئی حوالوں سے ایک دوسرے سے مماثلت بھی رکھتے ہیں مثلاً یہ ان آفاقی سچائیوں سے متعلق قیاس آرائیاں کرتے ہیں جن کی کسی بھی حسی حوالے سے تصدیق یا تردید نہیں کی جاسکتی۔ کائنات کے وجود اور زمان و مکان کے حوالے سے سائنسی اور مذہبی نظریات تو موجود ہیں مگر ان کے طبعی وجود کے حوالے سے تصدیق یا تردید ناممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح صوفیانہ حقائق وہ سچائیاں ہیں جن کو ثابت کرنے کے لیے ہم کسی منطق کا سہارا نہیں لے سکتے۔ صوفیانہ مکاتب اکثر ایسے اسرار اور روحانی تجربات کی بات کرتے ہیں جن کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ مابعد الطبیعیات میں اکثر ایسے سوالات سے بھی واسطہ پڑتا ہے جن کے جوابات مذہب کے پسِ منظر میں معلوم کیے جاسکتے ہیں، مثلاً انسان موت کے بعد کہاں جائے گا؟ وجود اور روح کا آپس میں کیا تعلق ہے وغیرہ۔ البتہ ان سوالات کو قبول اور مسترد کیا جاسکتا ہے۔

اساطیر اور مابعد الطبیعیات کے بعض پہلو ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں جب کہ بعض حوالوں سے یہ فلسفیانہ افکار ایک دوسرے سے متصادم بھی ہیں۔ اساطیر (myth) کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے انسانی مذاہب، خیالات، نظریات اور فکر سے رہا ہے۔ گویا اساطیر اور مابعد الطبیعیات کا تعلق کائنات کے پُر اسرار واقعات کی تفہیم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی اصول ہماری روزمرہ زندگی میں ایسے قوانین کی صورت میں موجود ہیں جو خدا نے کائنات کے اسرار و رموز کی شکل میں پوشیدہ رکھے ہیں۔ مابعد الطبیعیات کے تین بنیادی سوال وجود، حقیقت اور کائنات کی ابتدا کے بارے میں ہیں۔ اساطیری بیانیہ میں روایتی انداز میں تخیل کی مدد سے ان سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ گویا اساطیر میں جب کائناتی مسائل، حقائق، تخلیق اور وجود وغیرہ کی تفہیم کے حوالے سے ذکر ملتا ہے تو اس کا تعلق مابعد الطبیعیات سے جڑتا دکھائی دیتا ہے۔ فریڈرک سانٹیج اساطیر اور مابعد الطبیعیات کے تعلق کے بارے میں کہتے ہیں۔

"Myth's virtue is that it depicts non-visual events in a visual manner, so that, through its mediation, what is essentially intangible may be grasped and dealt with....Myth is ofen visual Metphysics"(۲۹)

ترجمہ:

اساطیر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں غیر بصری واقعات کو بصری انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کی مدد سے اہم غیر مادی حقائق کو سمجھا اور حل کیا جاسکے۔۔۔اساطیر بصری مابعد الطبیعیات ہے۔

اساطیر میں تخیلاتی دنیا مابعد الطبیعیاتی سوالات کے جواب دیتی نظر آتی ہے جب کہ مابعد الطبیعات ایسے سوالات کے جوابات منطق اور استدلال کی مدد سے دیتی ہے۔ اساطیر کا تعلق کسی بھی مخصوص معاشرے، مذہب اور علاقے سے ہوتا ہے۔اس کے برعکس مابعد الطبیعیات زمان و مکاں کی حدود و قیود سے ماورا ہوتی ہے ۔اساطیر میں واقعات کا مابعد الطبیعیات سے بلاواسطہ تعلق نظر آتا ہے۔ایسے غیر بصری اساطیری واقعات اور کردار جن کی توضیح ناقابلِ فہم ہے، بصری شکل میں مابعد الطبیعیاتی فکر کی تشریح کرتے نظر آتے ہیں۔

ہ۔اردو ناول میں مابعد الطبیعیاتی روایت (منتخب ناولوں کی روشنی میں)

ادب زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔دنیا بھر کا ادب اپنے اپنے علاقوں، تہذیب و ثقافت، سماج، معاشرت، مذہب اور اقدار کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ شعرا اور ادباء نے خونِ جگر سے ادب کی آبیاری کی اور اُردو ادب میں مختلف اصناف متعارف کروائیں۔اردو ادب نے اپنا دامن وسیع کرتے ہوئے تمام اصناف کو اپنے اندر سمو لیا۔ ناول اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جو عہد بہ عہد ارتقائی منازل طے کرتی رہی۔ ناول زندگی کے حقیقی مسائل، نشیب و فراز اور داخلی اور خارجی تضادات کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے عہد کی سچی تصویر پیش کرتا ہے اور ہماری زندگی اور دنیا کے اسرار کو لفظوں کے قالب میں ڈھال کر سب کے سامنے لاتا ہے۔ ناول کے ارتقائی سفر پر نظر دوڑائیں تو ناول نے ادب برائے ادب سے ادب برائے زندگی کا فاصلہ بہت احسن طریقے سے طے کیا۔ ہر دور کے نظریات اور رجحانات کا پرتو اُس دور کے ناول میں بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ کہیں ناول آزادی کی جدوجہد، مصائب و آلام کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ کبھی ادب کی لطافت و نزاکت کو مزید رنگینی عطا کرتا ہے۔ کہیں ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کرتا ہے تو کبھی تقسیمِ ہند کے المیے پر نوحہ کناں ہے۔ علامت نگاری ہو یا تجریدیت، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت ناول نے نوع بہ نوع اثرات قبول کرتے ہوئے ہر عہد اور زمانے کے تغیرات کو پذیرائی بخشی۔ فلسفہ جسے خشک مضمون کی حیثیت حاصل تھی بتدریج ادب کا حصہ بننے

لگا۔ فلسفیانہ مباحث اور نظریات کی ادب میں شمولیت نے ادب کو ایک نئی جہت عطا کی۔ فلسفیانہ مسائل ایک نئے انداز اور شکل میں قاری کے سامنے پیش کیے گئے۔ قاری نے نہ صرف ادب کی بو قلمونیوں سے حظ اُٹھایا بلکہ فکری اور فلسفیانہ لحاظ سے اس کے خیالات کو جِلا اور سوچ کو پرواز ملی اور اس پر کائنات کے کئی عقدے وا ہوئے۔ انسانی تخیل اور فکر نے موجود سے لاموجود کی کھوج، انسانی وجود کی حقیقت اور زندگی کے مقصد جیسے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی مباحث کو ادب کا حصہ بنانے کی سعی کی۔ یوں اردو ادب ایک مستحکم مابعد الطبیعیاتی روایت کا امین بنا۔ مختلف ادیبوں نے مابعد الطبیعیاتی افکار و خیالات مثلاً انسانی وجود، اس کی تلاش کے المیے، صوفیانہ، اساطیری، نفسیاتی اور کونیاتی عناصر وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا۔ ان ادبا میں قرۃ العین حیدر، انیس ناگی، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور سجاد، عبداللہ حسین، بابا محمد یحییٰ، مستنصر حسین تارڑ اور مرزا اطہر بیگ وغیرہ نمایاں اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۷ء) بیسویں صدی کی اہم ناول نگار ہیں۔ آپ کے تحریر کردہ ناولوں میں ''آخر شب کے ہم سفر''، ''میرے بھی صنم خانے''، ''کارِ جہاں دراز ہے''، ''گردشِ رنگِ چمن'' اور ''آگ کا دریا'' شامل ہیں۔ آپ کے تمام ناولوں میں انسان کے وجودی مسائل اور اپنی حقیقت کی تلاش نیز جدید دور کے انسان کے احساسات و جذبات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ ''آگ کا دریا'' (۱۹۵۹ء) کئی صدیوں کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے اندر کئی مابعد الطبیعیاتی جہات سموئے ہوئے ہے۔ ناول میں موجود تمام کردار اپنے اپنے عہد کے فلسفے کی بھرپور انداز میں نمائندگی کرتے ہیں۔ وقت ایک دریا کی مانند بہتا ہے اور انسان اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنی ذات کے جوہر کے ادراک اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ قرۃ العین حیدر انسانی فطرت میں موجود تجسس کو اُبھارتے ہوئے خدا کی ذات، تخلیقِ کائنات اور موت کے بارے میں سوالات اُٹھاتی ہیں۔

> ''اور اسی تاریکی میں کوئی دوسرا شاعر آہستہ آہستہ کہتا تھا۔ میں، جو بیوقوف ہوں اور جاہل، میں نے چاہا کہ دیوتاؤں کے چھپے ہوئے گھر کا پتا چلاؤں۔ میں نے مینوں سے پوچھا۔ وہ جس نے چھ آسمانوں کو سہارا دیا۔ کہیں وہی خدائے واحد تو نہیں؟ پہلوٹھی کے لڑکے کو کس نے دیکھا ہے؟ وہ جس کے جسم میں ہڈیاں نہیں، اس نے ہڈیوں والی مخلوق کو جنم دیا۔ وہ کون تھا، کون درخت، جس کی لکڑی سے یہ کائنات گھڑی گئی؟ وہ کون تھا جو جاننے والے کے پاس یہ پوچھنے گیا؟ یم۔ دنیا کا پہلا انسان جس نے مر کر موت کا پتا

چلایا۔اسے بھی جواب معلوم نہیں۔۔۔پھر اس نے پوچھا۔موت مجھے ختم کر دے گی، موت کو کون ختم کرے گا؟ وہ کون چیز ہے جو انسان سے اس کے موت کے گھنٹے میں جدا نہیں ہوتی؟ مرنے کے بعد انسان کا کیا ہوتا ہے؟ راجہ پرکشت کی نسل کہاں گئی؟ وہ کون ہے جو ہر شے پر قادر ہے لیکن ہر شے سے علیحدہ ہے؟(۳۰)

گوتم، چمپک، نرملا، ہری شنکر ناول کے شروع میں سامنے آنے والے کردار ہیں۔ جو ناول کے سارے زمانوں میں پوری آن بان کے ساتھ موجود ہیں اور ہر عہد کے فلسفے کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں۔ناول کا ایک اہم کردار کمال علم حاصل کرنے کے لیے نکلتا ہے تو اسے علم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔اسے مختلف فلسفوں سے واسطہ پڑتا ہے۔اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ کس مدرسہ فکر کا پہلے مطالعہ کرے۔ عمل، علم اور محبت سب راستے اس کے سامنے موجود ہیں۔اسے کپل کے نظریہ علم سے معلوم ہوتا ہے کہ

"پرش اور پراکرتی، روح اور مادہ ازل سے اکٹھے موجود ہیں۔مادہ حرکت کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے۔روح کائنات سے علیحدہ ہے۔کائنات کا اس کے بغیر بھی ارتقا ہوتا ہے کیونکہ ذہن، شخصیت، خود روح میں شامل نہیں لیکن پھر بھی روح مادے میں گھل مل جاتی ہے اور اس کی مکتی اسی وقت ہے جب مادے سے وہ خود کو جدا کر دے۔مادے میں مبتلا رہنے کا نتیجہ دکھ ہے۔اگر اسے اپنے اور پراکرتی کے فرق کا علم ہو جائے تو وہ آزاد ہو سکتی ہے۔پھر کمال نے پتن جلی کے یوگ ستر پڑھے۔اس کا ایشور خالقِ کائنات نہیں بلکہ روح ازلی تھی جو مادے میں مبتلا نہیں ہوئی۔ ویدانت والے وحدت الوجود کے قائل تھے۔"(۳۱)

ناول کے اختتام پر یہ پیغام ملتا ہے کہ سکون اور شانتی انہی لوگوں کو میسر آتی ہے جن کے اندر جذبہ تعمیر زندہ ہوتا ہے۔ناول کے کردار اجتماعی انسانی روح کے ترجمان ہیں۔جب انسان اجتماعیت کا حصہ بن جاتا ہے تو وہ نروان حاصل کر کے ابدیت میں شامل ہو جاتا ہے۔وہ پُر امید اور شانت ہو جاتا ہے۔

"چٹانیں، اوالانش، گلیشیر، آندھیاں۔ان سب میں سے گزرتا، سُر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا۔چوٹی پر وہ دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں وہ ہمیشہ کی طرح تنہا موجود ہے۔دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔تھکا ہوا، شکست خوردہ، بشاش پر امید، انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔وہ مسکرا کر نیچے اترا اور اس نے آنکھیں کھول لیں۔"(۳۲)

انیس ناگی (۱۹۳۹ء۔ ۲۰۱۰ء) اپنے عہد کے منفرد ناول نگار تھے۔ آپ وجودیت اور انفرادی آزادی کے علم بردار تھے۔ انیس ناگی، کامیو کے فلسفہ لایعنیت کے حامی تھے۔ ان کے ناول ''دیوار کے پیچھے'' اور ''زوال'' میں جابجا کامیو کے فلسفے کا رنگ موجود ہے۔ آپ کے ناولوں کے کردار ذہنی انتشار اور کرب کا شکار ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ زمانہ اور لوگ ان کی سوچ سے مختلف اور طمع کا شکار کیوں ہیں؟ ان کے کردار جس معاشرے کے رکن ہیں وہ ان کی توقعات اور خوابوں کے مطابق نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تخلیق چاہتے ہیں جو ان کے خوابوں کے عین مطابق ہو۔ ان کے ہاں اپنے عہد کا ضمیر بہترین انداز میں جھلکتا ہے۔ آپ کا ناول ''دیوار کے پیچھے'' (۱۹۸۳ء) وجودی فکر کا حامل ناول ہے۔ ناول کے ہیرو پروفیسر کے دل و دماغ میں غلط اور صحیح کی جنگ جاری ہے مگر وہ خارجی دباؤ کے تحت بے بس اور دباؤ کا شکار ہے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ لیکن وہ مجبور ہے۔ حالات کی سنگینی اور قسمت کے ہاتھوں پروفیسر نہایت مایوس ہے کہ دنیا کیا ہے جہاں انسان اپنی مرضی سے مرنے سے بھی قاصر ہے۔ وہ اپنے تمام حالاتِ زندگی لکھ کر کہیں روپوش ہو جاتا ہے۔ پروفیسر لاپتہ ہونے سے پہلے اپنے دوست احمد کے نام ایک خط اور کاغذوں کا بنڈل چھوڑ جاتا ہے۔ کہانی کا آغاز احمد کے نام ایک دوست کے خط سے ہوتا ہے۔

> ''احمد میں بہت منتشر ہوں، تھکا ہوا، بے مراد، منکر ہوں۔ میرے اندر خلا ہی خلا ہے۔ میں حقیقت بننا چاہتا تھا لیکن مجھے روک دیا گیا۔ میری نسل، بیمار نسل اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ یہ عہدِ زوال ہے۔''(۳۳)

ہیرو کی حقیقت میں ہم سب کا بھید نہاں ہے۔ اس کے طفیل ہم اپنے اپنے وجود کے تجربے سے از سرِ نو دوچار ہیں۔ پروفیسر اپنی موجودگی کی صورتِ حال سے آگاہی چاہتا ہے۔ وہ بار بار سوال اُٹھاتا ہے۔ حالانکہ اسے معلوم ہے کہ لایعنی کائنات میں کسی سوال کا جواب موجود نہیں ہے۔ جواب سے محروم رہنا سوالوں کا مقدر ہے۔ وہ بے قدر اور مجرم ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کا جرم کیا ہے اور وہ کس کے روبرو جواب دہ ہے؟ وہ زندگی کی معنویت اور مقصد کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ راحیلہ لطیف ناول کے اختتام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ناول کے اختتام پر ہیرو کا لاپتہ ہو جانا آج کے انسان کے ہست و نیست کے درمیان معلق ہونے کی داستان کہہ رہا ہے۔ اس کا داخلی کرب جب برداشت کی حد سے باہر ہو جاتا ہے تو وہ نیستی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ فکر، حزن، مایوسی، افسردگی اور اکتاہٹ مظہری شعور کے جذبی پہلو ہیں۔ جو اہم وجودیاتی نتائج کے حامل ہیں اور دل کی گہرائیوں کی خبر لا کر

وجود کی سچی داخلیت میں رنگ بھرتے ہیں۔ان کی اس داخلیت کی راہ نمائی میں انسان
مکان کو اختیار کرے یا لامکان کو، وہ بااختیار ہے۔''(۳۴)

ممتاز مفتی(۱۹۰۵ء۔۱۹۹۵ء)ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ابتدا میں وہ ایک روشن خیال اور ایسے مصنف کی حیثیت سے سامنے آئے جو فرائیڈ سے متاثر تھے۔ بعد ازاں آپ کے خیالات میں تبدیلی آئی اور آپ لبرل ازم سے کنارہ کش ہو کر تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ ''علی پور کا ایلی''اور ''الکھ نگری''آپ کے سوانحی ناول ہیں جو آپ کے خیالات ، نظریات اور حالاتِ زندگی کے ترجمان ہیں۔آپ کا ناول ''علی پور کا ایلی'' (۱۹۶۱ء)ایک بھٹکے ہوئے شخص کی داستانِ حیات ہے جسے رحمتِ خداوندی اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی محبت عطا کرتی ہے۔جب کہ ''الکھ نگری''(۱۹۹۲ء) ہندوستان سے پاکستان ہجرت کے علاوہ ممتاز مفتی کے باطنی کایا کلپ کی داستان ہے۔ نیز اس میں آپ نے قدرت اللہ شہاب کی ذات کا عمیق مشاہدہ بھی پیش کیا ہے۔ تصوف کی طرف رجحان اور نیک لوگوں سے ملاقات کے تناظر میں آپ کو جن عجیب و غریب، پُراسرار، مافوق الفطرت اور مابعد الطبیعیاتی واقعات کا سامنا کرنا پڑا، ان سب کا ذکر ''الکھ نگری'' میں ملتا ہے۔ایمن آباد سے لاہور واپسی کے دوران ممتاز مفتی غلطی سے لاہور سے پہلے کالا شاہ کاکو کے سٹیشن پر اُتر جاتے ہیں۔وہاں ممتاز مفتی کی ملاقات ایک ''بابے'' سے ہوتی ہے اور یوں انہیں علم ہوتا ہے کہ لاہور کا سراب دکھا کر اس سٹیشن پر انہیں جان بوجھ کر اُتروایا گیا ہے۔ اس حقیقت کے علم سے آپ کے ذہن پر سوچ کے کئی دروا ہوتے ہیں اور کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

''اس بابے میں اتنی طاقت ہے کہ مجھے مسمرائز کر سکے۔کالا شاہ کاکو کے اسٹیشن پر مجھے
لاہور کا سراب دکھا سکے کیا میں اپنی آنکھوں پر قادر نہیں ہوں۔اپنے حواس پر قادر نہیں
ہوں۔یہ بابے کون ہیں۔یہ رومی ٹوپی والا کیوں مجھے وہاں بلا رہا ہے۔پاکستان کیوں بنایا
گیا۔بنا نہیں، بنایا گیا ہے۔کیوں۔یہ امتیاز کیوں۔''(۳۵)

اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے پر مہربان ہوتا ہے تو اس کے دل میں اپنے ہونے کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔اسے ہر طرف اللہ کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی نے اللہ کو ایک بالکل مختلف روپ میں دیکھا تھا۔گھر میں بڑے بزرگوں نے یہ باور کروایا کہ خدا بات بات پر غصہ کرتا ہے۔مولوی صاحب سے علم ہوا کہ اس نے آگ کی ایک بھٹی تیار کی ہوئی ہے جس میں وہ گنہ گاروں کو پکڑ پکڑ کر ڈالتا ہے۔ معاشرے میں اپنی سہولت کے لیے لوگوں نے اللہ کا خوف پھیلایا۔یوں خدا سے گریز ممتاز مفتی کی زندگی کا حصہ بنا۔بعد ازاں

جاننے کی طلب اور اللہ پاک کے کرم سے آپ پر آگہی کے نئے در وا ہوئے اور اللہ پاک نے آپ کو اپنی محبت کے لیے چُن لیا۔

> ''رقت کی بات ختم ہوئی تو مجھے اللہ کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ مجھے جگہ جگہ اللہ کا احساس ہونے لگا۔ آسمان کی طرف دیکھتا تو ایک گھمبیر آواز آتی، ہاں میں ہوں پھر ایسے محسوس ہوتا جیسے سارے آسمان پر ان کا تخت بچھا ہوا ہو۔ درخت کی طرف دیکھتا تو یوں لگتا جیسے ہر پتے کے پیچھے اللہ چھپا بیٹھا ہو۔ ڈال ڈال کا جھولنا بنائے جھول رہا ہو۔''(۳۶)

ناول ''الکھ نگری'' ایسے پُر اسرار واقعات سے بھرا پڑا ہے جن کی مابعد الطبیعیاتی جہات نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ یہ ایک ایسی داستانِ حیات ہے جس کا اختتام رب کی محبت کی صورت میں انجام پذیر ہوتا ہے۔

عبداللہ حسین (۱۹۳۱ء۔۲۰۱۵ء) مشہور ناول نگار ہیں۔ آپ شہرہ آفاق ناول ''اداس نسلیں'' (۱۹۶۱ء) کے مصنف ہیں۔ آپ کا ناول ''اداس نسلیں'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ایک پُر سکون اور بہتر معاشرے کا خواہاں ہے، وہ اس کے لیے جد وجہد بھی کرتا ہے مگر مایوسی اور درد کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بالآخر وہ ہجرت کے دوران پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی ایک حملہ آور کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ ناول کا ہیرو بار بار موت سے ٹکراتا ہے۔ موت کا تصور وجود میں دہشت پیدا کرتا ہے کہ مقدر بالآخر تنہائی ہے۔ ہم اپنی ذات میں تنہا اور اکیلے رہ جائیں گے۔ ''اداس نسلیں'' میں موجود نسل اداسی اور داخلی کش مکش کا شکار ہے۔ اس کی ذات اس کی خواہشوں اور اس کی زندگی کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئی ہے مگر وہ وجوہات جاننے سے قاصر ہے۔ راحیلہ لطیف کا کہنا ہے کہ

> ''اگر زندگی بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق گزرا کرتی تو پھر خدا کو کون مانتا؟ سو خدا سے تعلق کا یہ بنیادی وجودیاتی سوال بھی عبداللہ حسین اُٹھاتے ہیں اور اس نسل کی داخلی کش مکش کا اظہار بھی کرتے ہیں جو تیزی سے آگے بڑھتی دنیا میں بدلتے رشتوں کی وجہ دریافت نہیں کر پائی۔''(۳۷)

بانو قدسیہ (۱۹۲۸ء۔۲۰۱۷ء) مشہور ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔ آپ نے اپنے شہرہ آفاق ناول ''راجہ گدھ'' (۱۹۸۱ء) کی بدولت ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ آپ کا یہ ناول مابعد الطبیعاتی دنیا کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ناول کی کردار ''سیمی'' عشقِ لاحاصل کا شکار ہو گئی ہے۔ عشق جس

کا تعلق اس کی روح سے ہے بالآخر اس کی موت پر منتج ہوتا ہے۔آفتاب ''نظریہ جبر''پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے نزدیک قدرت کے خلاف جانے کے بجائے،اس کی رضا میں راضی ہونا بہتر ہے۔ قیوم جسم کے راستے سیمی کی روح تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔یوں قیوم اور سیمی وجودی کرداروں کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ناول میں انسان کی دو انتہاؤں کا بیان بھی خوب صورت انداز میں کیا گیا ہے۔راجہ گدھ میں بتایا گیا ہے کہ

> ''دیوانگی دو طرح کی ہوتی ہے۔ایک دیوانہ پن وہ ہوتا ہے جس کی مختلف وجوہات بیان کی گئیں۔ جن کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان کائنات کی ارزل ترین مخلوق بن جاتا ہے۔ لیکن ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے۔ پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے۔دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے۔ حتٰی کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے۔''(۳۸)

ناول میں ''گدھ''علامتی طور پر ایسے انسانوں کی ترجمانی کرتا ہے جو حرام کھاتے ہیں۔ حرام کھانے سے انسانی جسم کن تغیرات سے گزرتا ہے اور آیا یہ آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔اس کے بارے میں پروفیسر سہیل کا کہنا تھا کہ

> ''میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے۔رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات ،شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔رزق حرام سے جو genes تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں۔ نسلِ انسانی سے یہ genes نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں یقین کر لو رزقِ حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔''(۳۹)

بلاشبہ بانو قدسیہ کا یہ ناول منفرد فکر و فلسفے ،تصوف اور وجودی نظریات کا حامل ہے۔

انتظار حسین(۱۹۲۵ء۔۲۰۱۶ء)اپنے عہد کے منفرد ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔آپ نے دیومالائی اور اساطیری عناصر کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔آپ کا ناول ''بستی''انسان کے اپنے ہاتھوں اس کی بستیوں کے اجڑنے کا المیہ ہے اور اس دور کے وجودیاتی بحران کی نمائندگی کرتا ہے۔اسی طرح آپ کا ناول

''آگے سمندر ہے''(۱۹۹۵ء) بھی کراچی میں ہونے والی دہشت گردی کے باعث انسان کے وجودیاتی زوال کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ ناول کے کردار اپنے خوابوں کی دنیا میں جیتے ہیں۔ یہ خواب ان کے دکھ، درد، کرب اور باطنی وجود کی ٹوٹ پھوٹ کی علامت ہیں۔

''ایسی تو بات نہیں ہے نذیر کی ماں، پچھلے مہینے جو میں نے خواب دیکھا تھا وہ میں نے تمھیں سنایا بھی تھا۔ دیکھا کہ شکار پور اجڑا پڑا ہے۔ جیسے سب کہیں چلے گئے ہوں۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا۔ ایک کتا کھڑا بھونک رہا تھا۔ میں ڈر گیا۔ سوچا کہ جلدی سے گھر چلو۔ گھر جانے کے لیے گلی میں مڑا ہوں۔ دو قدم چلا ہوں گا کہ آنکھ کھل گئی۔''(۴۰)

ناول کا مرکزی کردار ''جواد'' ذہنی انتشار اور شکستِ ذات کا شکار ہو کر حال سے فرار حاصل کرتے ہوئے ماضی میں چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ جواد کا اپنے دادا میاں اور دادا میاں کا اندلس کے عروج کے زمانے میں وہاں موجود بزرگ ہستیوں کو یاد کرنا خود کو ماضی میں گم کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ جب معاشرے میں متشدد اور ظالم قوتوں کا غلبہ ہو تو انسان ان کا شکار ہو کر اپنے وجود کے جوہر سے غافل ہو جاتا ہے اور نتیجتاً باطنی انتشار کا شکار ہو کر ماضی میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ ناول کے اختتام پر جب ''جواد'' صحت یاب ہو کر ہسپتال سے باہر نکلتا ہے تو وہ اس شہر میں خود کو اجنبی پاتا ہے اور حال اور ماضی کے دکھ ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔

''دہلیز سے قدم نکالتے نکالتے میں ٹھٹھکا۔ یہ کون سا شہر ہے۔ وہی شہر۔ تو پھر میں وہی نہیں ہوں، اس جانے بوجھے شہر میں اچانک سے اجنبی بن گیا تھا۔۔۔ کتنی دیر تک چلتا رہا۔ قدم خود ہی راستا تلاش کرتے رہے، بڑھتے رہے، مسجدیں، حمام، درخت شہتوت کے، زیتون کے، کھجور کے، ان ستونوں کو تو میں پہچانتا ہوں، یہ حمام الجوزہ ہے اور یہ رابطہ التوت ہے۔ یہ زناقتہ الوریٰ آگیا۔ اس راہ پر گیا تو مدینتہ الحمرا میں جا نکلوں گا۔۔۔ یہ کون سے کوچے میں نکل آیا ہوں۔ یہ تو باب الرملہ ہے۔ مگر باب الرملہ اور اتنا خاموش۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ مل کر جدا ہو رہے تھے۔ پھر چراغ کیوں روشن نہیں ہوئے۔ آگ بجھ گئی تھی۔۔۔ راکھ بہت اڑ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی ادھ جلا ورق کسی دیوان کا، کسی صحیفہ کا، کسی فیلسوف کے مخطوطے کا، کسی صوفی کے ملفوظات کا، باقی سکوت تھا۔ صرف ایک بلی بیچ راہ میں بیٹھی اپنے کنچے ایسی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔''(۴۱)

انور سجاد(۱۹۳۵ء۔۲۰۱۹ء) اردو ادب کے نامور ناول نگار ہیں۔آپ کا ناول ''خوشیوں کا باغ'' (۱۹۸۱ء)اپنے اچھوتے طرزِ تحریر کی بناپر اہمیت کا حامل ہے۔''خوشیوں کا باغ'' میں آپ نے علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے عہد کے انسان کی جسمانی اور روحانی اذیت کو بیان کیا ہے۔آپ نے اپنے ناول کا نام پندرہویں صدی میں پیدا ہونے والے ہالینڈ کے مشہور مصور ''ہائرانیمس بوش'' کی تصویروں کے دوسرے پینل ''خوشیوں کا باغ'' پر رکھا۔انور سجاد نے ان تصاویر کی مدد سے اپنے دور اور بوش کے دور کے حالات میں مماثلتیں دریافت کرتے ہوئے انسان کے وجودی بحران کو بیان کیا ہے۔وجودی بحران اور اندرونی انتشار کا شکار لوگ، ظلم و جبر کے پنجوں میں مقید خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔تیسری دنیا کے یہ لوگ معاشی اور مذہبی استحصال کے باوجود گنگ ہیں۔مگر ساتھ ہی ساتھ وہ انتظار کی کیفیت میں بھی ہیں وہ کسی ایسے مسیحا کی آمد کے منتظر ہیں جو انہیں آکر اس قعرِ مذلت سے نکالے۔

> ''تو کہاں ہے؟ہم تیرا انتظار کرتے ہیں۔ امام مہدیؑ! ہمارے جسموں کا پانی ختم ہوتا ہے۔ مسیح موعودؑ! ہمارے معدوں میں خلا ابھرتے ہیں۔ گوڈو! ہمیں ہماری کشتی تک لے جا، بادبان کھول، رسیاں تھام تو آتا کیوں نہیں؟ دن ڈوبتا کیوں نہیں؟ سورج نکلتا کیوں نہیں؟[۴۲]

ناول خود کلامی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ متکلم ایک چیف اکاؤنٹنٹ ہے۔جو اپنی حساس طبیعت کے باعث اندرونی کشمکش اور تناؤ کا شکار ہے۔ماں کی موت اس کے ذہنی انتشار کو مزید بڑھا دیتی ہے اور وہ انکم ٹیکس کے گوشواروں میں غلطی کے باعث ملازمت سے محروم ہو کر جیل پہنچ جاتا ہے۔ناول نگار نے بوش کی تصاویر کے تیسرے پینل کو تیسری دنیا قرار دیا ہے اور ترقی پذیر معاشرے میں رہنے والے یہ لوگ ذہنی خلفشار اور الجھنوں میں مبتلا رہتے ہیں۔اسی طرح متکلم اپنے باطن سے جنگ میں ہے۔وہ اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی کڑی ڈھونڈنا چاہتا ہے۔وہ آزادی چاہتا ہے۔استحصالی قوتوں سے آزادی کی خواہش اسے بے کل اور مضطرب رکھتی ہے۔ بالآخر اسے خود پر قابو نہیں رہتا اور وہ بے خود ہو کر ناچنے لگتا ہے اور اس پر یہ کشف ہوتا ہے کہ رقص انسان کو کیسے آزاد کرتا ہے۔

> ''ناچو ناچو قلندر وار می رقصم۔ میں ناچتا ہوں۔ میں ناچتا ہوں۔ وہ اپنے جسم کی کھال کو لباس کی طرح اتار کے ان کی طرف اچھال دیتا ہے نیزے پر ٹنگا سر کہ اس کو اس لیے

مقدس سروں میں سب سے مقدس کہا کہ اس کے ماتھے پر مقدس ہونٹوں میں سب سے مقدس ہونٹوں کی مہر ہے۔ناچو۔ناچو۔من برادر می رقصم۔میں ناچتا ہوں۔ناچتا ہوں۔ناچتا ہوں۔من برادر می رقصم۔ناچو کہ یار شیخ منصورم، ناچو کہ ملامت می کند خلقے، ناچو کہ یارِ شیخ منصورم۔۔۔زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ پر یہ کشف ہوتا ہے کہ رقص انسان کو کیسے آزاد کرتا ہے۔شی۔چپ۔تم اس آزادی کی قیمت ادا کر سکتے ہو؟ میں خواب میں جاگتا ہوں یا جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔''(۴۳)

بابا محمد یحییٰ (۱۹۳۶ء) صوفی بزرگ اور مشہور مصنف ہیں۔آپ کی کتاب ''پیا رنگ کالا'' (۲۰۰۱ء) مافوق الفطرت واقعات کا مجموعہ ہے۔یہ ان پر بیتنے والی ان ہونیوں، مشاہدات، کیفیات نیز وجودی اور باطنی سفر کے تجربات کا دلکش اور لطیف انداز میں بیان ہے۔بابا یحییٰ ایک فقیر کی دعا کی نتیجے میں پیدا ہونے ایسا بچہ تھا جو بچپن ہی سے عام بچوں سے الگ اور مختلف تھا۔آپ کے والد آپ کی والدہ سے اس بارے کہتے ہیں۔

''نیک بخت، بس یہ اچھی طرح جان لے کہ ہمارا یہ بچہ اب تیری میری گود سے جا چکا ہے۔اس کا چین سکون، گھر اور گود نہیں، مزار اور گورستان ہیں۔اس کا جنم ضرور ہمارے ہاں ہوا ہے مگر اس کی راہ اور منزل کہیں اور ہے۔آج کے بعد تُو اسے بھول جا۔ جو بھی یہ کرے اور جو چاہے، اسے مت روک اور ٹوک اور نہ ہی کبھی اسے ڈانٹنا۔پیروں، فقیروں اور بزرگوں کی دعاؤں برکتوں سے حاصل ہوئی اولاد، عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتی۔آج مزار کے اندر، خواب میں بابا بہاول شہید میرے پاس آئے اور اسے میرے سامنے سے اُٹھا کر اپنے پہلو میں لٹاتے ہوئے فرمایا۔اس کا چین اور قرار باپ اور بے بے کے پاس نہیں اپنے بابوں کے پاس ہے۔''(۴۴)

بچپن میں پہلے جموں سے آنے والے ایک فقیر منش چاچی کے ہاتھوں آپ کی روحانی تربیت ہوئی۔اس کے بعد دیگر کئی صوفیا، فقرا اور بزرگوں سے کسبِ فیض ملا۔گھوڑے شاہ سرکار کے مجذوب ٹٹو سائیں کی خدمت میں حاضری کا حکم ملا تو وہاں کالا لباس زیب تن کروایا گیا۔آپ نے فقیری کی جو منازل طے کیں اور قلبی اور باطنی صفائی کے دوران جن جن پُراسرار ہستیوں اور واقعات کا سامنا کیا۔ان سب کی تفصیلات آپ کے اس سوانحی ناول میں موجود ہیں۔بانو قدسیہ ''پیار نگ کالا'' کے بارے میں کہتی ہیں:

''محمد یحییٰ خان کی کتاب ''پیار نگ کالا'' شیش ناگ کی داستان ہے۔سنا ہے یہ دیومالائی سانپ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی روپار نگت پر آنکھ نہیں ٹکتی۔جوں جوں بڑھتا ہے اس کا

رنگ لا کھا اور آنکھیں سفید ہوتی جاتی ہیں۔ پھر جہاں سے یہ گزرے وہیں اس کی چاندی اتر کر جگہ کو کافوری کر جاتی ہے۔ پورا قد آنے پر یہ پورے کا پورا ہوا میں معلق ہو سکتا ہے۔ جو اس کی جانب دیکھ لے مسحور ہو جاتا ہے۔ سو سال کا شیش ناگ جون بدل کر انسان بن جاتا ہے۔ پھر اس کی نت نئی کہانیاں، نئے نئے روپ، انت کی شعبدہ بازی اور بے انت قصے ہیں۔''(۴۵)

بابا محمد یحییٰ خان کے ناول ''من مندر، من مسجد'' میں بھی صوفیانہ عناصر موجود ہیں۔ اس ناول میں مصنف نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ انسان کا دل خدا کی ذات کا ٹھکانہ ہے مگر ہم نے اس خانہ خدا میں دنیاوی بت ٹھہرا کر اسے مندر میں تبدیل کر دیا ہے۔ جب دل میں خدا کی ذات بسیرا کر لیتی ہے تو بظاہر نابینا لوگوں کے باطن کی نگاہ روشن ہو جاتی ہے۔

''میری یہ آنکھیں اندھی ہیں مگر میرے سوہنے اللہ نے میرے من کو روشن کر دیا ہے اور اس کے فضل و کرم سے میں آنکھوں والوں سے زیادہ دیکھ اور محسوس کر سکتا ہوں۔''(۴۶)

اسی طرح ایک جگہ حافظ صاحب، شاہ مراد کو دلاسا دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''بس آج کے بعد تم نے رونا نہیں۔۔۔ پتر جب من مندر ہوتا ہے تو صنم روٹھ جانے کا احتمال بہر طور رہتا ہے۔ اسی لیے کہتا تھا من مسجد بنالو، رب کو راضی کر لو۔۔۔ ایک فانی انسان کے لیے تیری آنکھوں کے دروازے کھل گئے ہیں۔ تو چھم چھم رو رہا ہے لیکن کیا کبھی اس کی یاد میں بھی آنکھوں کے بند ٹوٹے ہیں، تیرے دل کے کواڑ کھلے ہیں؟۔۔۔ دل میں پریتم بسائے گا تو یہی حال ہو گا اور اس پروردگار کو بسائے گا تو ہمیشہ شاد رہے گا۔''(۴۷)

رب تعالیٰ کی ذات کو جب دل میں متمکن کر لیا جائے تو سیدھی راہ مقدر بن جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے قرب اور محبت سے نواز دیتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی (۱۹۲۹ء۔۱۹۸۸ء) ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ کا ناول ''دشتِ سُوس'' تصوف کے حوالے سے لکھے جانے والے ناولوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک تاریخی اور غنائیہ ناول ہے۔ اس ناول کی کہانی مشہور صوفی حلاج بن منصور کے گرد گھومتی ہے۔ جنہیں ''انا الحق'' کا نعرہ لگانے کی پاداش میں مصلوب کر دیا گیا تھا۔ منصور بن حلاج ایک عاشق تھا۔ جس کا بھیس سمجھنے سے خلقت قاصر تھی۔ عشق کیا ہے؟ اس کے بارے میں دشتِ سُوس میں ہے:

عشق ایک مزرع گلاب ہے
اس کی پگڈنڈیاں اس کے لیے ہیں
جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں
عشق کی نشانیاں، توفیق اور مہربانیاں
ان کی منزل ہیں
اور مہجوریاں غم خاموش اور برداشت
کبھی نہ ختم ہونے والا سوز ہمیشگی اور اذیت ناکی
اس کی شان ہے
اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل
جہالت اور وحشتِ تنہائی
اور بے جادہ گردش ہے
عشق مزرع زندگی ہے (۴۸)

اسی عشق کی بدولت منصور بن حلاج ہوش و خرد سے بیگانہ ہوا، اس کی لاش کے ٹکڑے کیے گئے اور جلا کر راکھ دجلہ کی لہروں کے حوالے کر دی گئی مگر ہر طرف ''اناالحق'' کی آواز گونج رہی تھی۔ بادشاہِ وقت اس انا کے قتل پر پُر جوش تھا مگر در حقیقت یہ آواز لہو رنگ میں رنگ کر امر ہو چکی تھی اور حق کو پکارتے پکارتے تا ابد حیات پا چکی تھی۔

''وضو کر رہا ہوں تا کہ نمازِ عشق ادا کر سکوں۔ آقائے رازی کیا عشق مزرع زندگی نہیں۔ حسین کیا تم اتنے دیوانے ہو کہ تمھیں جان سے گزرنے کا بھی خیال نہیں۔ رازی نے کہا۔ کیوں نہیں کیوں نہیں۔ یہ جان ہی تو تھی جو راہ میں حائل تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں اور وہ ایسے مل گئے ہیں جیسے شراب پانی میں مل جاتی ہے۔ حسین حسین! فاطمہ نیشا پوری نے اپنے جگر کو تھا کر کہا۔ یہ کیا ہے؟ یہ تصوف ہے۔ راضی برضا۔ خوش۔ مستعد۔ اس کو پانے کی خوشی میں دیوانہ۔ تمھیں تکلیف محسوس نہیں ہوتی؟ آقائے رازی نے پوچھا۔ نہیں بخدا نہیں۔ مجھے تکلیف محسوس کیوں ہو۔ وہ میرا دوست ہے میں اس کا دوست ہوں۔ ہم میں صرف لاہوت اور ناسوت کا فرق ہے۔ اب وہ بھی نہیں رہا اناالحق۔

اس نے اتنے زور کا نعرہ لگایا کہ آسمانوں میںوں اور دجلہ کی لہروں نے مل کر کہا، اناالحق
اناالحق،اور پھر یہ صداا طراف بغداد سے سنائی دینے لگی۔''(۴۹)

جمیلہ ہاشمی نے ناول کے آخر میں نہایت خوبصورت انداز میں عشق اور تصوف کی وضاحت کرتے ہوئے قاری کو لافانی کے عشق کا اصل رنگ اور روپ دکھایا ہے۔

مرزا اطہر بیگ(۱۹۵۰ء) ناول نگار، ڈرامہ نویس اور افسانہ نگار ہیں۔آپ کا ناول'' غلام باغ'' (۲۰۰۶ء)اردو ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔''غلام باغ''ارذل نسلوں، اساطیر، عشق، وجودیت،دیوانگی اور انسانیت جیسے فلسفیانہ مباحث کے گرد گھومتا ہے۔ناول میں دو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔''ارذل نسلیں اور خصی کلب''۔ارذل نسلیں صدیوں سے بے توقیری اور تذلیل کا شکار ہیں۔اس نسل کا ایک آدمی یاور حسین شہر میں اپنا منفرد سماجی مقام بناتا ہے اور عزت و توقیر سے رہتا ہے۔دوسری طرف خصی کلب استحصالی طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔اس میں روحانی، مذہبی، سیاسی، غیر سیاسی اور سماجی ادارے وغیرہ شامل ہیں۔یہ طبقہ ارذل نسلوں پر صدیوں سے حکمرانی کر رہا ہے۔ناول کا کردار کبیر وجودیاتی انتشار کا شکار ہے۔ ناصر دماغ کے امراض کا ڈاکٹر ہے جو اپنے وجود کی تباہی کے بعد دوبارہ بلندی کی طرف گامزن ہے۔زہرہ کی آگہی عام آدمی کی ذہنی سطح سے کافی بلند ہے۔چنانچہ وہ اپنی اصل کی تکلیف دہ جستجو میں گرفتار ہے۔

''جب وہ اسٹئیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے بیٹھی تھی مگر ابھی انجن سٹارٹ نہیں کیا تھا تو اسے یاد آیا کہ اس کی موجودہ کیفیت کچھ ویسی ہی کیفیت ہے، جیسی وہ کیفیت تھی جب اس نے اپنے باپ سے پہلی بار اپنے نسلی اصل کے بارے میں سوال کیا تھا اور پھر سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا مگر وہ پھر بھی بچ نکلی تھی۔''(۵۰)

یہ ناول آغاز سے اختتام تک انسان کے وجود کی صورتِ حال کا مطالعہ ہے۔اساطیر کی مدد سے انسانی واہموں کی جھلک دکھائی گئی ہے۔انسان کے شعور کا سفر، موت، مایوسی، خوف، ڈر، لایعنیت، یقین یہ سب عناصر مل کر انسانی وجودی انتشار اور باطنی زندگی کی کش مکش کو ظاہر کرتے ہیں۔ناول کے اختتام پر کبیر کی سرگوشی زہرہ کو ایک گہری سوچ میں چھوڑ جاتی ہے۔''فکشن کے خالق کو خدا بننے کا اختیار کس نے دیا۔''(۵۱)

مستنصر حسین تارڑ(۱۹۳۹ء) عہدِ جدید کے لکھنے والوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔آپ کے ناولوں میں ''بہاؤ''، ''راکھ''، ''قربتِ مرگ میں محبت''اور ''منطق الطیر جدید''شامل ہیں۔آپ کے ناول فنا، انسانی وجود کی زوال پذیری، خارج اور باطن پر اثر انداز ہونے والے عقائد، انسانی قدروں کی گم گشتگی اور تصوف کے

گرد گھومتے ہیں۔ حال ہی میں سامنے آنے والا آپ کا ناول ''منطق الطیر جدید'' (۲۰۱۸ء) طلسماتی اور روحانی فضا کا حسین مرقع ہے۔ ناول کی سحر انگیز فضا قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ناول کا انتساب آپ نے اپنے مرشد عطار کے نام کیا ہے۔ صوفیانہ رنگ کا حامل یہ ناول قاری کو کئی زمانوں کی سیر کراتا ہے۔ ناول سمجھنے کے لیے قاری کو مذہبی روایات، تاریخ اور اساطیر کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ مصنف سات ایسے پرندوں کا تعارف کرواتا ہے جو اپنے اپنے زمانوں اور عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے سچ کی تلاش میں گامزن ہیں۔ اپنی جستجو کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے اپنے زمانوں سے نکل کر ایک تھکا دینے والا سفر کرتے ہوئے وہ ٹلا جوگیاں پہنچتے ہیں۔ دو ہزار سال قبل جانے کہاں سے ایک جوگی گورکھ ناتھ ٹلا جوگیاں آیا اور اس ٹیلے کی چوٹی کو اپنی قیام گاہ بنالیا۔ جو اس کے نام سے منسوب ہو گیا۔ مستنصر حسین اس ٹیلے کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''یہ عام سا ٹیلہ: جہلم کی وادی میں سے تقریباً تین ہزار دو سو فٹ کی بلندی تک پہنچتا آخر کیوں اتنا برگزیدہ ٹھہرا کہ یہ نہ وہ کوہ طور تھا، نہ ہی یروشلم کی کوئی پہاڑی تھی اور نہ ہی کوئی جبلِ نور تھا اور اس کے باوجود اس کے اندر کونسی ایسی الوہی کشش تھی کہ جن لوگوں کے اندر عشق آتش بھڑکتی تھی، آسمانوں پر جاتی عرش کو سلگاتی تھی وہ اس کی جانب یوں کھنچے چلے آئے، بے اختیار اس کی کوہ نوردی اختیار کی، جیسے لوہے کے ذرے ایک مقناطیس کی جانب ایک بے بسی کی حالت میں لڑھکتے چلے آتے ہیں۔''(۵۲)

ان پرندوں کے علاوہ ناول کا کردار موسیٰ حسین جو کہ ایک آرٹسٹ ہے، بھی ٹلا جوگیاں کی طرف عازمِ سفر ہے۔ جو اپنے اندر موجود وجدان اور وارفتگی کی تلاش میں ہے۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر اس کی ملاقات ان سات پرندوں سے ہوتی ہے۔ جو اپنے اپنے عہد سے نکل کر سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ان سات پرندوں میں سے پہلے پرندے نے طور کی سلگتی ہوئی جھاڑی سے، دوسرے نے گوتم بدھ کی لاغر پسلیوں سے، تیسرے نے مصلوب عیسیٰ کے ہاتھ کے لہو کی چھوٹی سی بوند سے، چوتھے نے غارِ حرا کے شگاف سے، پانچویں پرندے نے بلخ کے ٹھنڈے آتش کدوں کی راکھ سے، چھٹے پرندے نے قرۃ العین طاہرہ کے کنویں سے اور ساتویں پرندے نے منصور حلاج کے بدن کی راکھ سے جنم لیا۔ مزید ان پرندوں میں صاحباں، ہیر اور سوہنی کے نور سے بنے پرندے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ٹیلے پر پہنچ کر موسیٰ وہ نہیں رہا تھا جو وہ پہلے تھا بلکہ اسے تالاب کے پانی میں اپنے عکس کی جگہ ایک پرندے کا عکس نظر آتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر جب پرندے ٹلہ جوگیاں سے نیشاپور کی طرف محوِ پرواز ہونے لگتے ہیں تو موسیٰ انہیں بتاتا ہے کہ ان کی شباہتوں میں فرق آگیا

ہے۔ وہ تالاب میں اپنا آپ دیکھتے ہیں تو ان پر آشکار ہوتا ہے کہ عشق کی آمیزش نے ان کے چہروں پر محبت، نرمی اور ملاحت بھر دی ہے۔ گویا ٹلا جوگیاں کا سفر رائیگاں نہیں گیا تھا۔ وہ موسیٰ کو جو کہ ایک پرندے کی صورت متشکل تھا، اپنے ساتھ چلنے کا کہتے ہیں تو موسیٰ جانے سے انکار کرتے ہوئے انہیں دوبارہ ملنے کی امید دلاتا ہے کہ آج کا سچ بھی جب ہیئت بدلے گا تو تم سب اس کی جستجو میں پھر نکلو گے تب ہم سب پھر ملیں گے۔ ناول کا اختتام مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''ابتداء آفرینش میں ہر سُو تاریکی تھی اور پانیوں پر ایک دھند تیرتی تھی اور پھر اذن ہوا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔ صرف تالاب کے گرد کھنڈر دیواروں کے طاقچوں میں نانک کی چلہ گاہ کی بوسیدہ محرابوں میں ہی نہیں، تالاب کے پانیوں میں بھی اور ہری بھرتری کی کھنڈر ہو چکی سمادھی پر بھی چراغ جل اُٹھے اور ہر سُو روشنی ہو گئی۔''(۵۳)

ناول کی مابعد الطبیعیاتی روایت کا مختصر جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تقسیم اور ہجرت کے بعد درپیش مسائل، مصائب و آلام نے انسان کے داخل کو کرب، اور اذیت سے دوچار کیا جس کے نتیجے میں نہ صرف معاشرہ روحانی اور اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر ہوا بلکہ اس کا اپنا وجود بھی انتشار کا شکار ہوا۔ اخلاقی قدروں کی گم گشتگی، دیوانگی، بے توقیری، مایوسی، ناامیدی، ڈر اور خوف کے سائے اس کے وجود پر منڈلانے لگے۔ اس صورتِ حال میں حساس ادبا نے عام آدمی کے کرب اور دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اسے ادب کا حصہ بنایا۔ اساطیر کے ذریعے اپنا رشتہ ماضی اور مشرقی روایات سے جوڑنے کی کوشش کی، روحانی بالیدگی کے لیے عام فہم انداز میں تصوف کے مباحث کو ادب میں پیش کیا نیز مابعد الطبیعاتی عناصر کو تخلیقی عمل کا حصہ بنایا اور انسان کے وجودی بحران اور ظاہر و باطن کی خلیج کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی۔ مابعد الطبیعیاتی عناصر کی مدد سے قاری کی فکری نمو ہوئی اور اسے ایک جہانِ دیگر نظر آیا، جو اس کے وجودی اور روحانی مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ آج کے عہد کا انسان اپنی حقیقت کی تلاش میں ہے۔ زندگی کی بے معنویت، لایعنیت اور مغائرت سے تنگ آچکا ہے۔ اپنے جوہر کی تلاش اور اپنے وجود کی شناخت جیسے مسائل کے باعث وہ ظاہر و باطن کے تضادات کا شکار ہے۔ ادبا نے ان تمام مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے قاری کی توجہ اس امر کی طرف بھی دلانے کی کوشش کی ہے کہ تکمیلِ وجود کے سفر میں سرگرداں زیادہ تر انسان اس سچائی سے لاعلم ہیں کہ ان کی فلاح اور سکون کا راستا مخلوقِ خدا اور ذاتِ مطلق کی محبت میں پوشیدہ ہے۔ بہت کم لوگ اس سچائی سے آگاہ ہو کر معاشرے میں تعمیری کردار ادا کر کے ابدیت، سکون اور شانتی پاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔احمد ندیم قاسمی،(تبصرہ)خوب سے خوب تر،ازابدال بیلا،انہونیاں،فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور،۱۹۹۴ء،ص۲۱

۲۔ابدال بیلا،(انٹرویو)ازشیما سعدیہ،اسلام آباد،۱۴؍فروری۲۰۱۹ء،بوقت ۳بجے دن،بروز بدھ

۳۔اشفاق احمد،(تبصرہ)بیلا کہانی،ازابدال بیلا،رنگ پچکاری،فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور،۱۹۹۴ء،ص۱۱

۴۔کیول دھیر،(انٹرویو)ازشیما سعدیہ،بذریعہ ٹیلی فون،۲۶؍جون۲۰۱۹ء،بوقت ۱۱بجے دن،بروز بدھ

۵۔محمد کاظم،مسلم فکر و فلسفہ،مشعل بکس،لاہور،۲۰۰۸ء،ص۲۱

۶۔فضل الرحمٰن،پروفیسر،اُردو انسائیکلوپیڈیا(جلد سوم)،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۱۹۹۷ء،ص۴۷

۷۔ابوالاعجاز صدیقی،ادبی اصطلاحات کا تعارف،اسلوب اردو،لاہور،۲۰۱۵ء،ص۳۶۴

۸۔محمد کاظم،مسلم فکر و فلسفہ،ص۲۱

۹۔شمس الرحمان فاروقی،لغاتِ روزمرہ(تیسرا اضافہ و تصحیح شدہ ایڈیشن)،انجمن ترقی اردو(ہند)،۲۰۱۱ء،ص۲۸۹

۱۰۔محمد نوید ازہر، پاکستانی غزل میں ما بعد الطبیعیاتی عناصر، غیر مطبوعہ مقالہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد،۲۰۱۱ء،ص۱۵

۱۱۔نجیب رام پوری، نئی اردو لغت(جامع)،فرید بک ڈپو، نئی دہلی،۲۰۰۴ء ص۸۴۹

۱۲۔محمد عبداللہ خان خویشگی،فرہنگِ عامرہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۰۴ء،ص۵۳۴

۱۳۔وارث سرہندی ایم اے، علمی اردو لغت(جامع)، سردار محمد پبلشرز،لاہور،۱۹۷۹ء،ص۱۳۱۸

۱۴۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۹۴ء،ص۱۲۲۷

۱۵۔محمد اکرم چغتائی، تشریحی لغت،اردو سائنس بورڈ،لاہور،۲۰۰۱ء،ص۵۲۵

۱۶۔ A,R.Lacy, A dictionary of philosophy, published by Routledge,11 New fetter lane, London ,1996,P.206

۱۷۔https://dictionary.cambridge.org/،۱۲؍فروری۲۰۱۹ء،۱۱:۲۴am

۱۸۔ http://www.dictionary.com ،۱۲؍فروری۲۰۱۹ء،۱۱:۳۴am

۱۹۔ The New Encyclopedia Britannica,USA, vol 24,15th Edition ,1985, P.1

۲۰۔شیوموہن لعل ماتھر،قدیم ہندی فلسفہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی ہلی،۱۹۹۸ء،ص ۷۹

۲۱۔ محمد حفیظ، ڈاکٹر، گوتم بدھ زندگی اور افکار، آزاد انٹر پرائزرز، لاہور، س، ص ۵۶۔۵۵
۲۲۔ حبیب حق، کلاسیکی یونان تہذیب فلسفہ فنون لطیفہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵۰
۲۳۔ یاسر جواد، فلسفیوں کا انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۴۱
۲۴۔ محمد کاظم، مسلم فکر و فلسفہ، ص ۱۱۹
۲۵۔ اکبر لغاری، فلسفے کی مختصر تاریخ (اشاعت دوم)، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۲
۲۶۔ یاسر جواد، فلسفیوں کا انسائیکلوپیڈیا، ص ۳۲۶
۲۷۔ محمد نوید ازہر، پاکستانی غزل میں ما بعد الطبیعیاتی عناصر، غیر مطبوعہ مقالہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۵۲
۲۸۔ حمید طاہر، ڈاکٹر، (ابتدائیہ)، از محمود علی انجم، پروفیسر، نورِ عرفان اسلامی تصوف (ما بعد الطبیعیات) کا تحقیقی، مشاہداتی اور تجرباتی جائزہ، جلد اول، س، ص ۲۹
۲۹۔ Frederick Sentage, Mythical Thought and Metaphysical Language , The Journal of Relegion, Vol 41,No.2, The University of Shicago Press, 1961, P.109
۳۰۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، سنگِ میل پبل کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۴۷
۳۱۔ ایضاً، ص ۳۳
۳۲۔ ایضاً، ص ۵۷۴
۳۳۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۵
۳۴۔ راحیلہ لطیف، اردو ناول میں مابعد الطبیعیاتی عناصر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۹۳۔۱۹۲
۳۵۔ ممتاز مفتی، الکھ نگری، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۶۳
۳۶۔ ایضاً، ص ۳۱۰
۳۷۔ راحیلہ لطیف، اردو ناول میں مابعد الطبیعیاتی عناصر، ص ۱۰۴
۳۸۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبل کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۳۸۳
۳۹۔ ایضاً، ص ۲۷۶
۴۰۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبل کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۷

۴۱۔ایضاً، ص ۳۲۳۔۳۲۲

۴۲۔انور سجاد، خوشیوں کا باغ، سنگِ میل پبل کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰

۴۳۔ایضاً، ص ۱۷۴۔۱۷۳

۴۴۔ محمد یحییٰ خان، پیار نگ کالا، سنگِ میل پبل کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۸

۴۵۔ بانو قدسیہ، (تبصرہ) حرفے چند، از محمد یحییٰ خان، پیار نگ کالا، سنگِ میل پبل کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۸

۴۶۔ محمد یحییٰ خان، من مندر، من مسجد، حماد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۴۷۔ایضاً، ص ۱۱۴

۴۸۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سُوس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۸

۴۹۔ایضاً، ص ۴۹۹۔۴۹۸

۵۰۔اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۵۳۳

۵۱۔ایضاً، ص ۸۷۸

۵۲۔ مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر، جدید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۳۔ایضاً، ص ۲۰۰

باب دوم:

ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں صوفیانہ عناصر

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔انسان نے مادی لحاظ سے ترقی کرنے کے نت نئے طریقے تو دریافت کر لیے مگر وجودی سطح پر وہ جس انتشار اور کرب کا شکار ہے اس سے رہائی کی کوئی صورت نہ پا کر وہ ایک مستقل اذیت اور بے چینی سے دوچار ہو گیا ہے۔اپنی ذات کی جستجو، اپنی حقیقت کی تلاش اور اپنی تخلیق کے مقصد سے ناآشنائی وہ بنیادی مسائل ہیں جن کے حل سے لاعلمی نے انسان کے باطن کو تنہائی کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ گو انسان اپنی جذباتی، نفسی اور قلبی تسکین کے لیے وقتی سہارے تلاش کر لیتا ہے مگر اس کا داخل ایک ناقابل بیان کرب اور تکلیف سے اَٹا پڑا ہے۔وہ روحانی طور پر پژمردہ ہو کر بے معنی زندگی گزار رہا ہے اور اس اذیت، کرب اور تکلیف سے نکلنے کی ہمت نہیں پاتا۔اس کی خواہش ہے کہ کوئی مسیحا آئے،اس کی روحانی اور قلبی اذیتوں کو محسوس کرے،اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس گرداب سے باہر کھینچ نکالے اور اس کا ظاہر اور باطن نور اور روشنی سے بھر دے۔

مصنف معاشرے کا بہترین نباض ہوتا ہے۔وہ اپنی تحریروں میں بالواسطہ طور پر ان مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ جس سے معاشرہ نبرد آزما ہوتا ہے مگر خُلاصی کی کوئی راہ نہیں پاتا۔انسان کے داخلی، باطنی اور روحانی کرب کی دوا کیا ہے؟اس کی ذات کے بھید اور اسرار اس پر کیسے عیاں ہو سکتے ہیں؟کیسے اپنی ذات کی گتھیاں سلجھا کر وہ آسودگی اور راحت حاصل کر سکتا ہے؟موجود سے لاموجود کی دریافت کیسے عمل میں لائی جا سکتی ہے؟ان تمام سوالات کے جوابات ہر اُس مصنف کے ہاں موجود ہیں جو معاشرے کو ایک طبیب کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی اصلاح کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ابدال بیلا کا شمار بھی ایسے ہی ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔آپ نہ صرف قاری کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں بلکہ قاری کو سوچنے سمجھنے اور محبت کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔آپ کی یہ محبت انسانوں سے انسانیت تک کا سفر طے کراتی ہے اور بالآخر اس منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے جس کی تلاش میں آج کے دور کا ہر شخص بے نیل و مرام پھر رہا ہے۔ابدال بیلا نے موجود کے جوہر کی تلاش میں مابعد الطبیعاتی علوم کا سہارا لیا ہے۔ذات کے عرفان، روحانی نشو و نما اور بالیدگی کا راستا تصوف کی صورت میں موجود ہے۔آپ کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' جوہر کی تلاش اور جستجو کی کہانی ہے۔ جوہر کی تلاش

جس مابعد الطبیعیاتی عنصر کے ذریعے ممکن دکھائی گئی ہے وہ تصوف ہے۔ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں صوفیانہ عناصر کا جائزہ لینے سے پہلے ہم ''تصوف'' کے مآخذ اور لغوی اور اصطلاحی معنی کا سرسری جائزہ لیں گے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف اور واضح الفاظ میں انسان کی پیدائش کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''ترجمہ: اور میں نے جن اور آدمی اسی لیے بنائے کہ وہ میری بندگی کریں۔''(۱) چنانچہ انسان نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے آدابِ بندگی پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی اور خود کو گناہوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے اس ذاتِ باری تعالیٰ کی بارگاہِ اقدس تک رسائی کے لیے ایک راستا تلاش کیا جو ''تصوف'' کہلایا۔اس راستے کے ذریعے اس نے تزکیہ نفس اور تطہیرِ قلب کو زندگی کا شعار بنایا اور اپنی زندگی خالق کی اطاعت کے لیے وقف کر دی۔ گویا تصوف معرفتِ الٰہی کا نام ہے۔ یہ فکری، نظری یا علمی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ تصوف کی کوئی ایک منطقی، جامع اور مانع تعریف کرنے سے اہلِ تصوف خود بھی قاصر ہیں۔ ہر چند کہ علمائے کرام نے تصوف کی تعریف بیان کرنے کو کوشش کی ہے۔ مگر ہر تعریف تصوف کے کسی ایک جُز یا چند ایک پہلوؤں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے اور سمجھنے والے جُز کو کل سمجھ لیتے ہیں۔ مختلف لغات اور کتب میں تصوف کے لغوی اور اصطلاحی معنی کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

فیروز اللغات اُردو جامع میں تصوف کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں:

> ''تصوف: پشمینہ پہننا۔ صوفیوں کا عقیدہ یا مسلک۔ علمِ معرفت، دل سے خواہشوں کو دور کر کے خدا کی طرف دھیان لگانا۔ تزکیہ نفس کا طریقہ''(۲)

فرہنگِ آصفیہ میں تصوف کے بارے میں درج ہے:

> ''تصوف۔ع۔اسم مذکر۔ خواہشِ نفسانی سے پاک ہونا۔ وہ علم جس کے وسیلے سے صفائی قلب حاصل ہو۔ تزکیہ نفس کا طریقہ اشیا عالم کو مظاہرِ صفاتِ حق جاننا۔ قطع عنِ الغیر یعنی سوائے واجب الوجود کے سب اشیا کو موہوم اور لا سمجھ کر مشغولی کے لائق نہ جاننا۔ مذہبِ صوفیا''(۳)

پروفیسر انور جمال اپنی کتاب ''ادبی اصطلاحات'' میں رقم طراز ہیں:

> ''روحانیت کی اصطلاح ہے۔ فرد کے روحانی تجربے کو ''تصوف'' کہتے ہیں۔ تصوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صاحبِ حال کے تجربے میں آتا ہے۔ شریعت وہ عمرانی

قوانین ہوتے ہیں جن کے تجربے میں تمام انسان شامل ہیں لیکن صوفی کے حال میں دوسرا شخص شامل نہیں۔ یہ فرد کی مکمل تنہائی کا تجربہ ہے۔ جو نا قابل بیان ہے یعنی اس تجربے کا ابلاغ (communication) نہیں ہو سکتا کیونکہ ''ابلاغ'' عمرانی عمل ہے۔ پیغمبر بھی صوفی ہوتا ہے لیکن وہ تنہائی کے روحانی تجربے کے بعد واپس (معاشرے) میں آتا ہے جب کہ صوفی روحانی تنہائی میں رُک جاتا ہے۔۔۔ تصوف کا لفظ ''صوف'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اُون کا کھردرا لباس۔''(۴)

شبلی نعمانی اپنی کتاب **''الغزالی''** میں تصوف کے اشتقاق اور مادے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''تصوف کا لفظ اصل میں سین سے تھا اور اس کا مادہ سوف تھا۔ جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا اور چونکہ حضرات صوفیہ میں اشراقی علما کا انداز پایا جاتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے ان کو سوفی یعنی حکیم کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ سوفی سے صوفی ہو گیا۔''(۵)

تصوف اور اخلاقیات کی بلند پایہ اور معروف کتاب **''امداد السلوک''** میں **شیخ قطب الدین دمشقی**، حضرت سہیل تستریؒ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

''تصوف نام ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا، مگر اس طرح کہ اس معیت کو بجز حق تعالیٰ کے کوئی جان نہیں سکتا۔''(۶)

مختلف لغات اور کتب میں بیان کردہ تعریفوں کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تصوف بطور لقب استعمال کیا جانے والے نام ہے جس کے اشتقاق اور مادے کے بارے میں اختلافات موجود ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق پر غور و فکر کیا جاتا ہے نیز تصوف انسانی قلوب کی صفائی اور تزکیہ نفس حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ علاوہ ازیں صوفیائے کرام نے اپنے اپنے مشاہدات، ذوق، حال اور قلب پر وارد ہونے والی کیفیات کے مطابق تصوف کی تعریف کی ہے۔ امام شعرانیؒ کو تصوف کا امام سمجھا جاتا ہے آپ کے نزدیک تصوف ''بس احکامِ شریعت پر بندہ کے عمل کا خلاصہ ہے۔''(۷) یعنی تصوف شریعت کے تمام احکامات کی پیروی کا نام ہے۔ محمد علی بن حسین بن علی بن ابی طالبؓ کی نظر میں ''تصوف نیک خوئی و خوش اخلاقی ہے جو زیادہ نیک خو ہو وہ زیادہ صوفی ہوتا ہے۔''(۸) گویا اخلاق کی عمدگی اور نیک طینتی کا نام تصوف ہے اور

جو جتنا زیادہ خوش اخلاق اور نیک طینت ہو گا وہ اتنا زیادہ صوفی ہو گا۔ مشہور صوفی حضرت جنید بغدادیؒ تصوف کی تفہیم ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''تصوف یہ ہے کہ حق تجھے تیرے وجود سے فنا کر کے اپنے ذریعے سے بقاعطا فرمائے۔''(۹) یعنی حق تعالیٰ کا انسان کے وجود کو اپنی محبت کی ضرب سے فنا کر کے اسے بقا دینا تصوف ہے۔ ابو الحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں''۱۔ تصوف نفسانی لذتوں کو ترک کر دینے کا نام ہے۔ ۲۔ تصوف اخلاقِ پسندیدہ کا نام ہے۔''(۱۰)

صوفیا کرام کی بیان کردہ تعریفوں کی روشنی میں ہم کہ سکتے ہیں کہ تصوف شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا نام ہے۔ صاحبِ تصوف دل سے ماسوااللہ ہر غیر کی محبت نکال دیتا ہے، دنیاوی لذتوں سے دور بھاگتا ہے، قرآن وسنت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا، مخلوقِ خدا سے خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے، سب کے ساتھ احسان کا معاملہ رکھتا ہے، اور اللہ پاک کے احکام پر عمل کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونا اور مخلوقِ خدا کے ساتھ احسان و محبت قُربِ خداوندی کا باعث بنتا ہے۔ یہ امر طے ہے کہ انسان دنیاوی لذتوں اور نفسانی خواہشات سے کنارہ کش ہو کر اور قرآن و سنت پر عمل کر کے خدا کی معیت اور محبت حاصل کر سکتا ہے۔ تصوف ایک ایسا راستا ہے جس پر خلوص، وفا اور تسلیم و رضا سے چل کر مصنوع، صانع کی طرف جاتا ہے اور اس راستے پر چلتے ہوئے اپنی ذات کو فنا کر کے اُس ذات پاک کی حقیقت کو جان کر بُعد کو مٹانے والا ''صوفی'' کہلاتا ہے۔ یعنی تصوف کی راہ پر چلنے والے یا تصوف کی راہ اپنانے والے کو صوفی کہتے ہیں۔

لفظ ''صوفی'' کے مادہ اشتقاق کے بارے میں مختلف علما نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عام طور پر تصوف کی کتابوں میں ''صوفی'' کے لغوی معانی اور مادہ اشتقاق کے بارے میں مختلف حوالے ملتے ہیں مثلاً صفا بمعنی پاکیزگی اور تطہیرِ قلب، اہلِ صفہ، صف، صفوت القضا بمعنی گدی پر بال، ثیو صوفیا یونانی لفظ بمعنی حکمتِ الٰہی، صوفانہ ایک قسم کا پودا اور صوف بمعنی پشمینہ یا اُون وغیرہ۔ مختلف لغات اور کتب میں لفظ ''صوفی'' کی درج ذیل تعریفیں ملتی ہیں۔

فیروز اللغات جامع کے مطابق

''صوفی۔ پشمینہ پوش اہلِ تصوف۔ متقی۔ پارسا۔ پرہیز گار''(۱۱)

درسی لغت کے مطابق

''صوفی (فاعل۔ مذکر۔ واحد) ا۔ وہ شخص جو اہلِ طریقت کے راستے پر چلے یا تصوف کا

پیر وکار ہو۔ ۲۔ گناہ سے پاک صاف۔ پرہیز گار ''(۱۲)

ابولاعجاز صدیقی ''ادبی اصطلاحات کا تعارف'' میں صوفی کے بارے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ

''عام طور پر کلمہ صوفی کو صوف ہی سے مشتق سمجھا جاتا ہے۔ اصطلاح میں صوفی وہ شخص ہے جو تصوف کی فکری، روحانی اور اخلاقی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے۔''(۱۳)

مختصر یہ کہ صوفی تصوف کا پیروکار، متقی اور پارسا شخص ہوتا ہے جسے طبیعت کی پاکیزگی اور خوش اخلاقی کی بدولت رب اپنا دوست رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ صوفی تمام مجاہدات، مراقبات اور ریاضتیں صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا منتہا اس پاک ذات کا دیدار ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ''تو جسے اپنے رب سے ملنے کی امید ہو اسے چاہیے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔''(۱۴) تصوف کی اصل اس آیتِ مبارکہ سے اخذ کردہ ہے۔ یعنی تصوف کی بنیاد کامل توحید، کامل تقویٰ اور کامل محبت پر ہے اور یہ تینوں عناصر قرآن پاک سے ماخوذ ہیں۔ صوفی ان تینوں عناصر کو اپنی زندگی کا حصہ بناتا ہے۔ وحدہ لاشریک ذات پر مکمل اور کامل ایمان رکھتا ہے اور اس کی رضا اور خوشنودی کو اپنی حیات کا مطمع نظر گردانتا ہے۔ متقی اور پرہیز گار ہوتا ہے۔ اخلاقی صفات سے آراستہ ہوتا ہے۔ خوفِ خدا رکھتا ہے۔ محبتِ باری تعالیٰ سے اس کے جسم کا بال بال جکڑا ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے کہ فانی اشیا کا عشق بھی فانی ہوتا ہے اور باقی کا عشق ہر وقت تر و تازہ رہتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ صوفی ہر آن معرفتِ الٰہی کا خواہشمند ہے اور عشقِ الٰہی میں مست و مستغرق رہتا ہے۔ صوفی اہلِ نظر ہوتا ہے اور ہر آن، ہر لمحہ زمان و مکاں کی حدود سے ماورا اپنے محبوبِ حقیقی کے تصور میں ڈوبا رہتا ہے۔ شریعت اور طریقت پر کاربند رہتا ہے۔ ماسوااللہ کسی غیر کا خیال دل میں نہیں لاتا اور عشق کی بھٹی میں جل کر اپنی منزل پالیتا ہے۔

ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں تصوف کے بیان کردہ سارے رنگ نظر آتے ہیں اور عام انسان کے اندر موجود صوفی کسی نہ کسی بہانے سامنے آتا دکھائی دیتا ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' انسانی جوہر کی تلاش کا سفر ہے اور جوہر انسانی اور رموزِ حیات کی تفہیم کی اس راہگزر پر موجودات کو جن غیر مرئی معاملات سے سے واسطہ پڑتا ہے، کیسے دلوں کا مالک ایک لمحے میں دل کی کایا پلٹ دیتا ہے اور بندہ اپنا جیون اور دنیا تیاگ کر عشق کی وادی میں قدم رکھنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ عشق مجازی، عشقِ حقیقی کی سیڑھیاں چڑھتا ہے، دل کے قفل کھلتے ہیں، بند

دروازے وا ہوتے ہیں اور دل کے آنگن میں عشق کی امر بیل ہر دریچے کے ساتھ لپٹ کر نئے موسموں کی نوید سناتی ہے۔ ابدال بیلا نہایت سادہ انداز میں اپنے اس ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں ان اسرار و رموز سے پردہ ہٹاتے نظر آتے ہیں۔ جب دل میں سچی لگن، کسک اور تڑپ ہو اور سب سے بڑھ کر نصیب میں روشنی ہو تو دروازہ کھلتے سمے نہیں لگتا۔ جب دروازہ کھلتا ہے تو ہو سُو نور کا سیلاب نظر آتا ہے۔

> ''دو زانو ہو کر ادب سے بیٹھ جاؤ۔ دروازہ کھلتا ہے۔ یہاں نہ تم ہو، نہ میں ہوں، صرف روشنی ہے۔ صرف روشنی ہے۔ جو ہر خیر کی ماں ہے۔ چاروں طرف اس روشنی میں بندھے اس کی بندگی کے ذرے ہیں۔ کہکشاں در کہکشاں سر بسجود۔ یہ مقامِ سجدہ ہے۔ باہجھ وصال اللہ دے باہو سب قصے کہانیاں ہو''(۱۵)

ابدال بیلا نے ''دروازہ کھلتا ہے'' میں عام آدمی کی زندگی کے تجربات اور کیفیات کو صوفیانہ رنگ دیتے ہوئے مجاز پر حقیقت کا رنگ چڑھایا ہے۔ ناول کی بنت ایسی ہے کہ قاری کو خشک اور ادق فلسفیانہ مسائل اور صوفیانہ مباحث نہیں ملتے بلکہ عام، آسان فہم اور پُر اثر انداز میں اخلاقی اقدار کی پاسداری کے ساتھ ساتھ خدا اور اس کے رسول سے محبت کا درس ملتا ہے۔ ابدال بیلا نے ''دروازہ کھلتا ہے'' میں جن صوفیانہ عناصر کو بیان کیا ہے۔ ان میں محبتِ الٰہی کو اولیت حاصل ہے۔ اللہ سے محبت انسان کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔ اللہ نے کائنات تخلیق کی کہ اسے اپنی پہچان مطلوب تھی۔ سو اب یہ اس کا حق ہے کہ ہر شے سے بڑھ کر اس سے محبت کی جائے اور اس کی معرفت حاصل کی جائے۔

الف۔ محبتِ الٰہی:

اللہ تعالیٰ نے جب ارواح کو پیدا کیا تو ان سے فرمایا ''الست بربکم ؟'' ارواح نے ''بلیٰ'' کہ کر اس کی ربوبیت کو تسلیم کیا اور اپنی اطاعت کا اعلان کیا۔ یوں روح کا رشتہ اسی روز خالقِ حقیقی سے جُڑ گیا۔ روح جب عالمِ بالا چھوڑ کر عالمِ فنا کا حصہ بنی تو اس دنیا کی چکا چوند میں کھو کر اپنی تخلیق کا مقصد بھول گئی۔ انہی ارواح میں سے کچھ ارواح ایسی بھی تھیں جو اپنی اصل سے دُوری کو برداشت نہ کر سکیں اور اس جہان کا حصہ بننے کے باوجود اُس جہان کی لگن اور مالکِ کائنات کی بندگی کو اپنی تخلیق کا جواز مانتے ہوئے اس کی معرفت کی تلاش میں بے چین پھرنے لگیں۔ اصل سے دُوری نے ان کے اندر عشق کی آگ کو بھڑکایا۔ فراق نے آتشِ شوق کی چنگاری کو ہوا دی۔ ان ارواح نے علائقِ دنیا سے بے زاری اختیار کی۔ اپنے قلوب میں عشق کی شمع روشن کی اور اپنے محبوب کی

رضا کو اپنی زندگی کا مقصود سمجھا اور مومنین کے قلب میں جگہ پائی۔ مولانا روم اصل سے دور ہونے کا کرب اور دُکھ بانسری کی زبان میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''بانسری سے سُن کیا حکایت کرتی ہے اور جدائی کی کیا شکایت کرتی ہے کہ جب سے مجھے بنسلی سے کاٹا ہے میرے نالوں سے مرد و عورت سب روتے ہیں۔ میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو تاکہ میں عشق کے درد کی تفصیل سناؤں۔ جو کوئی اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے۔''(۱۶)

عشق ایک مابعد الطبیعیاتی کیفیت ہے۔ انسانی عقل اس بارے میں کوئی بھی استدلال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ عاشق کیسے اپنے محبوب کی خوشنودی کے لیے خطروں سے کھیلتا ہے اور اپنا سب کچھ تیاگ دیتا ہے۔ یہ عشق اور محبت اگر اللہ کی ذات سے ہو تو عقل مارے حیرت کے گنگ رہ جاتی ہے کہ کیسے عشق آگ میں کود جاتا ہے اور کیسے عاشق سر نیزے پر چڑھا دیتا ہے۔

محبتِ الٰہی کی آرزو ہر مومن کے قلبِ باصفا میں جاگزیں ہوتی ہے۔ خدا کی کھوج، جستجو، دریافت، تلاش اور اس کے دیدار کی شدید ترین آرزو کا نام معرفت ہے۔ جب دل میں اس پاک ذات کی طلب اور خواہش ہو تو دل کو باقی بتوں سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ باقی مکینوں کو رخصت کر کے گھر کے مالک کو اپنے مکان میں رہنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات سے محبت تو ایمان کا لازمی جُز ہے۔ اللہ سے محبت اس کی اطاعت کا تقاضا کرتی، مخلوقِ خدا سے محبت کا راستا دکھاتی اور ہر اس عمل اور فعل سے اجتناب برتنے پر مجبور کرتی ہے جو محبوب اور محب میں دوری پیدا کرے۔ اللہ کی ذات اپنے لیے خالص محبت پسند کرتی ہے یعنی جس دل میں اس کی ذات ہو، اس میں کوئی دوسرا نہ ہو۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۶۵ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

''اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں کہ انھیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں۔''(۱۷)

ابدال بیلا ''دروازہ کھلتا ہے'' میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ایمان والے اللہ سے جان، مال اور اولاد سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، اس کی محبت میں سب قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں نیز کسی بھی حالت میں اس کا در نہیں چھوڑتے۔ ہر تنگی، پریشانی اور مصیبت میں بھی اس کے در سے لو لگائے رکھتے ہیں اور اس ذاتِ باری کے نور سے اپنی ذات کے بجھے ہوئے دیے کے روشن ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ ''دروازہ کھلتا ہے''

میں قربِ خداوندی اور محبتِ الٰہی کے حصول کے لیے سچی لگن اور کامل یقین کے ساتھ بارگاہِ کبریا پر بار بار دستک دینے اور اسی ایک در کا ہو کر رہنے کو ہی منتہائے زندگی قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ من و تو کا فاصلہ سمٹ سکے۔

''اصل فاصلہ تو انہی روشنی کی اکائیوں کا ہے۔ جس کی راہ آسمان پہ نور سے کھدی ہوئی ہے۔ نور سے بڑھ کر آسمان سے اتری چوکھٹ پر کون سی دستک ہے۔ تم بھی کنڈی ہلاؤ۔ میں بھی دستک دیتا ہوں۔ ہم پر یہی واجب ہے۔ دروازہ کھولنے کا وعدہ کسی اور کا ہے۔''(۱۸)

جب طلب اور چاہ روح کی گہرائیوں میں موجزن ہو تو محبوب کے در پر بھکاریوں کی طرح بیٹھے رہنے اور بار بار دستک دینے سے ہی مقصود کو پایا جا سکتا ہے۔ اس کی ذات سے اسی کو مانگا جاتا ہے۔ وہ دل پر القا ہو کر، دروازہ کھولے تو اس کی رضا اور نہ بھی کھولے تو اس کی مرضی۔ جب دل پر محبت کا نزول ہوتا ہے تو انسان کو آفاقی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس زمین پر، محبت ایک ایسی شے ہے جو آسمانی ہے۔ یہ زمین و آسمان کے فاصلے مٹا دیتی ہے۔ واصف علی واصف محبت کی آفاقیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''محبت وحدت سے کثرت اور کثرت سے وحدت کا سفر طے کراتی ہے۔ محبت آسمانوں کی بے کراں وسعتوں کو ایک جست میں طے کر سکتی ہے۔ محبت قطرے کو قلزم آشنا کر دیتی ہے۔ محبت زمین پر پاؤں رکھے تو آسمانوں سے آہٹ سنائی دیتی ہے۔ محبت کرنے والے کسی اور مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ یہ خلوص کے پیکر دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ دراصل محبت زندگی اور کائنات کی انوکھی تشریح ہے۔ یہ قرآن فطرت کی الگ تفسیر ہے۔ یہ حیات و مرگ کے مخفی رموز کی جداگانہ آگہی ہے۔''(۱۹)

انسان کا دل قصرِ نورانی ہے اور جب رب تعالیٰ کا عشق اسے اپنا گھر بناتا ہے تو اس کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ قدرتِ خداوندی جوش میں آکر جب کسی روح پر مہربان ہوتی ہے تو اس کے لیے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔ دل کے خرمن پر عشق کی چنگاری برق بن کر گرتی ہے اور سب جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ ابدال بیلا اپنے کردار ''تم'' سے مخاطب ہو کر اس راز سے پردہ اُٹھاتے ہیں کہ کیسے عشق کی لگن انسانی وجود کو ریزہ ریزہ اور گھائل کر دیتی ہے اور عشق کی چکی میں پس کر انسان ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

''جب سے تیری مدھانی میرے وجود میں پھرنے لگی ہے، میرے اپنے وجود کے حصے بخرے ہونے لگے ہیں۔ تم مجھ میں مکھن کی طرح تیرنے لگی ہو اور میں لسی بنا تیرے

پیروں کی گرفت میں پڑی چاٹی میں پڑا ہوں۔اس لیے میں وقت دریا کا وہ ریلا ہوں، جو
اس لمحے تیرے پُل کے نیچے بہہ رہا ہے۔"(۲۰)

جب عشق کی لگن لگتی ہے تو محب ہر وقت خیالِ یار میں مستغرق رہتا ہے۔ چہار سُو اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں دیکھنا چاہتا اور آرزو مند ہوتا ہے کہ یار اس کی بے چین و بے قرار نظروں کو اسے دیکھنے سے نہ روکے۔ "جب تیرے علاوہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا، تو جو نظر آتا ہے وہی دیکھنے دو۔"(۲۱) تصوف کے مدارج میں ایک اہم درجہ فنا فی الذات ہونا ہے۔ بقا صرف ربِ کریم کی ذات کو ہے۔ دنیا کی ہر شے فنا ہو جائے گی۔ صرف وہی باقی رہے گا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ جو اس ذاتِ باری تعالیٰ کے عشق میں ڈوب کر اپنا سراغ پالیتا ہے وہ امر ہو جاتا ہے۔ اسے بقا اور دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ مر کر بھی نہیں مرتا۔ "میں" اور "تُو" جب ملتے ہیں تو کثرت، وحدت میں بدل جاتی ہے، دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ ابدال بیلا نے اس نقطے کی اشارہ کرتے ہوئے نہایت لطیف پیرائے میں اس کی تفہیم کی ہے۔

"برتے جانے کی دنیا اور ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ ہی سے بھری ہوتی ہے۔ کافی ہوتی ہے
اپنے لیے۔ یہی اصل دنیا ہے۔ جسے رہنا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جسے روئی کے گالوں کی طرح
نہیں اُڑنا۔ کبھی اس نے کانچ کا گلاس بن کر نہیں گرنا، کرچی کرچی نہیں ہونا۔ اسے ہی
صرف رہنا ہے۔ اسی میں یہ دنیا رہتی آئی ہے۔ اسی میں آنے والی ساری دنیاؤں نے رہنا
ہے۔ جن کا وعدہ ہے۔ یہ سچی دنیا ہے۔ یہ من کی دنیا ہے۔ یہاں روحوں کا چلن ہے۔ یہ
روحوں کی بستی ہے۔ جہاں روحیں بِنا جسم کی پہچان کے بستی ہیں، جیتی ہیں۔"(۲۲)

ابدال بیلا یہ گہری رمز کی بات قاری کو باور کراتے ہیں کہ دل جب تجلیاتِ الٰہی کا مرکز بن جاتا ہے تو پھر اسے بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ جو اللہ کی ذات سے محبت کرتا ہے اور اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتا ہے اللہ پاک بھی اس کا ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کے کان بن جاتا ہے، کبھی اس کی آنکھیں تو کبھی اس کے ہاتھ بن جاتا ہے۔

"تو میرا ہوا ہے تو مجھ پہ تیرا ہونا واجب ہو گیا ہے۔ تیری سرنڈر کہانی میں، تیری "میں"
کا کردار اب نہیں رہا۔ وہ کردار اب میں ہو گیا ہوں۔ یہ "چھوٹی میں" سے "بڑی میں"
کی سفر کی کہانی ہے۔ "بڑی میں" کہتی ہے۔ جا اب میں تیری آنکھیں ہوں۔ تیرے پیر
ہوں۔ تیرے ہاتھ ہوں۔ جو تجھے دیکھنا ہے، دیکھو، میری آنکھ سے دیکھو۔ جو پکڑنا ہے،

پکڑ، میرے ہاتھوں کی گرفت سے جدھر چل کے جانا تُو چاہے ہے، جا۔اب میری رفتار
تیری دسترس میں ہے۔"(۲۳)

جس دل میں رب کی محبت سما جائے وہ دنیاوی محبتوں اور لذتوں کی طرف سر اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔اس کے دھیان میں بس ایک ذات ہوتی ہے۔اس کا دھیان کہیں نہیں بھٹکتا۔ابدال بیلا سائیں اور زینب کے واقعے کی مدد سے قاری کے ذہن و دل پر محبت کے اس نقش کو ثبت کرتے ہیں۔زینب سائیں پر عاشق تھی اور ایک رات اس سے ملنے اس کی کوٹھڑی میں پہنچ گئی۔وہ اس سے پہلے بھی سائیں کے وجود پر کئی بار دستک دے چکی تھی۔مگر سائیں دیوار بنا رہا، دروازہ نہیں کھولا۔اس رات سائیں تھر تھر کانپنے لگا اور زینب کے کہنے پر کہ اسے محبت کی سمجھ نہیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ

"سب سمجھ ہے مجھے، آج سے نہیں، کئی مہینوں سے ہے۔بے سمجھ نہیں میں۔سب سمجھتا ہوں۔بے سمجھی تو ہے۔تجھے سمجھ نہیں آئی دیکھا نہیں میرا دھیان اور طرف ہے۔کملی ہے عقل نہیں آئی تجھ میں۔تو کیسے میرے دھیان میں آئے۔میرا دھیان تو اُدھر ہے۔اِدھر، سائیں نے داہنے ہاتھ کی بند مٹھی کھولی۔اندر چڑمڑ ہوئی ایک سوا ایک گرہوں والی رسی کی تسبیح اس کی ہتھیلی پہ پڑی تھی۔یہ ہے میرے دھیان میں۔"(۲۴)

اللہ تعالیٰ کی محبت عطا اور نصیب ہے اور جب اس کی محبت نصیب ہو جائے تو ہر وقت اسی کی طرف دھیان رہتا ہے اور جب دھیان میں "وہ" ہو تو کوئی اور کیسے دھیان میں آسکتا ہے۔جب دل میں اللہ کی محبت رچ بس جائے تو دیدارِ الٰہی کی تڑپ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ناول کا کردار "میں"، "تم" سے مخاطب ہو کر محبوب کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ابدال بیلا نے محبت کی اس کیفیت کو نہایت خوب صورت انداز میں رقم کیا ہے۔

"میں تو ایسے ملن کی دعا کرتا ہوں، جو کبھی تو ہو، چاہے اس دن، جب سارے سوئے ہوؤں کو جاگے جانے کا بگل سنائی دے تم بھی وہیں ہو۔میں بھی وہیں ہوں اور ہم دونوں مل کے اس جہان میں دن رات بنانے والے کو اس سمے دیکھیں، جب دن اور رات کی فصیلیں گرادی جائیں، صبح اور شام سے ہماری گردنیں نکل آئیں۔جب اندھیرے کا کوئی خوف نہ ہو، جب روشنی ایسی شفاف اجلی اور پاوتر ہو کہ وہ کسی ننگے کو ننگا نہ کرے۔لباس بن کے ڈھانپ لے لباس بھی ایسا جو ایک خوشبو بن کے پوری کائنات میں

پھیلا ہوا ہو اور پھر وہ مقدس خوشبو اپنے الوہی جسم کو پہنے اور ہمیں اپنے دیدار کا اذن دے اور ہم اکٹھے اسے دیکھ کے سجدے میں گر جائیں اور کبھی سر نہ اُٹھائیں۔''(۲۵)

اللہ تعالیٰ نے مٹی کے جسموں میں روح پھونک کر زمین پر بھیج دیا۔ جسم زمین پر پہنچ کر دنیا کی رنگا رنگی میں کھو گئے اور اسے فراموش کر دیا۔ ظاہر کی آنکھ سے باہر کی دنیا دیکھنے میں مگن ہو گئے اور باطن کی آنکھ نہ کھولی۔ بظاہر ہم بینا تھے مگر باطن میں نابینا تھے۔

''ہم نے اپنے اندر چھپی ہوئی اس کی روح کو نہ دیکھا۔ روح کی روح نہ پہچانی۔ وہ تو روشنی ہے۔ روشنی اس لیے ہوتی ہے کہ اس سے دیکھا جائے۔ ہم نے اس کی طرف آنکھیں بند کر لیں تو ہم اندھیرے میں چلے گئے۔ گوشت پوست کے لفافے جو ہماری روحوں کو پہنائے گئے تھے، آنکھیں ان کے اوپر لگی رہ گئیں۔ اوپری آنکھیں اوپر اوپر سے ہی صرف دیکھنے لگیں۔ ہمیں مغالطہ ہو گیا ہم بینا ہیں۔ دیکھ سکتے ہیں۔ دیکھنے کو باہر ہے کیا؟ جدھر تھا، ادھر آنکھ ہی نہ کھولی تو کچھ دکھتا کیسے۔''(۲۶)

ابدال بیلا نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھانے کی بھرپور سعی کی ہے کہ ہمارے ظاہر اور باطن کا بُعد اس سے دوری کا اصل سبب ہے۔ جب ہم اپنے باطن کی حقیقت جان لیں گے ہم اسے پالیں گے۔ ہم اپنے ظاہر کی سجاوٹ اور سج دھج میں لگے رہتے ہیں مگر من میلے کا میلا رہتا ہے۔ جب من کا میل نکل جاتا ہے، من اُجلا، صاف اور شفاف ہو جاتا ہے تو ''وہ'' اپنا دروازہ کھول دیتا ہے۔ جب اس ذات کا دروازہ کھل جاتا ہے تو دل میں اس ذات پاک کی روشنی گھر کر لیتی ہے تو کائنات کی ہر شے منور ہو جاتی ہے۔ روزِ اول عہدِ الست کرنے والا جب روبرو حاضر ہوتا ہے تو ہوش و خرد ساتھ چھوڑ دیتے ہیں:

''یہ کون سا موڑ ہے دل کیوں دھڑکنا بھول گیا ہے۔ خون کیوں اپنا رنگ روپ کھو کے شہ رگ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ سر سے پاؤں تک پورے جسم سے کیسے ایکا ایکی میں درد کی ساری تاریں نکل گئی ہیں۔ صرف الوہی لذت کا احساس روح میں رہ گیا ہے۔ سارا شعور صرف روح کی آنکھ میں ہے۔ میری ہر آنکھ کی پتلی تمھیں پہچانتی ہے۔''(۲۷)

محبتِ الٰہی کی بارش روح کو سیراب کر دیتی ہے اور بندے کا اندر باہر روشن ہو جاتا ہے۔ طوفان تو تباہی اور بربادی مچاتے ہیں، بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دیتے ہیں مگر محبتِ الٰہی روشنی اور نور کا وہ طوفان ہے جو دل کی بستیوں کو ابدیت

عطا کرتا ہے۔

''طوفان ایسا نہیں ہے۔ یہ تو نور کی اجلی لطیف پاکیزہ ایسی کرنوں سے بنا ہے کہ جس پہ آنکھ بھر نظر ڈال لے وہ بستی ہمیشہ کے لیے بستی رہے، زندہ رہے۔ جس بھٹکے مسافر پہ ایک محبت کی نظر ڈال لے اس کے قدموں کی سمت میں منزل کا تارا رکھ دے۔ وہ جو چلنے کے تین سو ساٹھ ممکن راستے ہوا کرتے ہیں، انہیں ایک جنبش میں سمت نما سے منہا کر دے۔ سارے کے سارے تین سو ساٹھ بت ایک ضرب سے گرا دے۔ اندر باہر کے سب اندھیروں کو سرکا دے۔ مقدس نور کی برسات کا برسنے کا موسم رہنے دے۔ اپنے قرب کی روشنی میں جی بھر کے نہانے دے۔''(۲۸)

ابدال بیلا نے ''دروازہ کھلتا ہے'' میں اللہ کی ذات سے محبت کو نہایت لطیف اور دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کی محبت کا نشہ ایسا ہے کہ کسی اور طرف پلٹنے نہیں دیتا۔ جس کو وہ اپنی محبت عطا کرتا ہے اسے دنیا کی ہر شے سے بے نیاز کرتے ہوئے اس پر اپنے قُرب کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ وہ دروازہ کھولنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے بس وہ بندے کی دستک کا منتظر ہوتا ہے، جب بندہ دنیا کے مصائب وآلام سے گھبرا کر تھکا ٹوٹا اس کی جانب آتا ہے، اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو وہ اسے اپنے دامنِ رحمت میں سمیٹ لیتا ہے۔ جسے اس کی محبت کی لو لگ جائے اسے اس کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ جب اس کی معرفت نصیب ہو جاتی ہے تو انسان کے اندر کا میلا پن دور ہو جاتا ہے۔ دل جب اُجلا ہو جائے تو ہر سُو اس کا نور اور روشنی نظر آتی ہے۔

ب۔ مجاز سے حقیقت کا سفر:

اکثر انسان کا دل اسے لے کر مجاز کی راہ پر جا نکلتا ہے اور انسان لوگوں کی محبت میں اپنا آپ لُٹا دیتا ہے۔ ایسے حالات میں بعض اوقات اللہ کا کرم شاملِ حال ہوتا ہے اور انسان مجاز کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' کا باب ۳ ''صاحباں'' اس باب کے مرکزی کردار صاحباں کے مجاز سے حقیقت تک کے سفر کی کہانی ہے۔ مصنف نے بہت خوب صورت انداز میں قاری کے سامنے اس صوفیانہ رمز کو آشکار کیا ہے کہ اللہ کی عنایت شاملِ حال ہو تو ایک ولی کی نگاہ اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی ایک بات دل کی دنیا بدل دیتی ہے، انسان دنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے منہ موڑ کر اپنی ذات خدا کی مخلوق کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ صاحباں لدھیانہ کی طرہ دار اور تیکھی طوائف تھی۔ ملکوتی حسن و جمال کی مالک۔ جو دیکھتا،

دیکھتا ہی رہ جاتا۔ سوڈی شاہ کا ڈیرہ لدھیانہ کی تحصیل پھلور میں تھا۔ سوڈی شاہ کے آستانے سے گزرتے ہوئے جانے جی میں کیا سمائی، شاہ جی کے آستانے کے سامنے بگھی رکوا کر دل لگی کی انداز میں شاہ جی کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔ ''شاہ جی۔ کوئی ہمارا بھی حصہ ہے آپ کی دیگ میں یا نہیں۔''(۲۹) اللہ کے دوستوں کے در سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ یہ لمحہ بھی قبولیت کا تھا۔ اس پل کو مقبولیت عطا ہوئی اور شاہ جی نے ہامی بھر لی۔

> ''بس شاہ جی نے ایک دو لمحے اسے بیراگی آنکھ کی گوشہ نشینی سے اسی طرح بگھی میں سجی راج گدی پہ بیٹھی کو دیکھا، پھر ہاتھ اُٹھا کے عجیب اندازِ مستانہ سے بولے، ہے! اتنا حصہ ہے کہ تجھ سے سنبھالے سنبھلنا نہیں۔''(۳۰)

پھر پھلور کے باسیوں نے دیکھا، پھلور کی شہزادی جس کی ایک نگاہِ ناز پر ہزاروں پروانے اپنی جان نثار کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے، کیسے اپنے اندر کی الجھی ڈور کا سرا پا کر شاہ جی کے در کی کنیز بن گئی۔ شاہ جی کے لاکھ سمجھانے بجھانے پر بھی باز نہ آئی۔

> ''تمہیں ہوا کیا ہے ؟ میری آنکھیں کھل گئی ہیں شاہ جی۔ تیری مت ماری گئی ہے۔۔۔ مجھے مقصد مل گیا ہے۔ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تجھے پتا نہیں تیرے گلے میں سرتیوں اور مرتیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ تو ادھر راکھ سر پہ ڈالنے آگئی ہے۔ نہ شاہ جی۔ سدھ سُر کا سرا تو آج ہتھ آیا ہے۔ پہلے تو بے سُری تھی۔۔۔ جب سرا ہی ہتھ میں نہ ہو تو بندہ بے سُرا ہی ہوتا ہے۔ سرے بن سُر کی سمجھ کیسے کدھر آتی ہے شاہ جی۔ کون سا سرا ہاتھ آگیا تیرے ؟ اپنی اندر کی اُلجھی ہوئی ڈور کا۔''(۳۱)

مجاز سے حقیقت کا سفر خالقِ مطلق کی رضا اور مرضی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ اُس کی مرضی ہے کہ وہ کس دل پہ اپنی محبت کے جلوے ظاہر کر کے اسے اپنی محبت کے رنگ میں رنگنے کے لیے چُن لے۔ یہ رمز کی بات ابدال بیلا شاہ جی کی زبانی صاحباں کو کہلواتے ہیں:

> ''نہ تیری دل لگی تیرے بس میں تھی۔ نہ میری یہ آرزو کہ تیرے سنورے ہاتھ سے ادھر لنگ چلے۔ لمحے لمحے کا نصیب ہوتا ہے سمے سمے کی بات ہوتی ہے۔ زیادہ سوچا نہ کر ہمارے اختیار میں صرف مغالطے ہیں۔ کھیڈ ساری اس نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی ہے۔''(۳۲)

انسان خطا کا پتلا ہے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کے پلٹنے کا منتظر رہتا ہے۔ اور جو اس کی طرف آنا چاہے، اس کے دروازے پر دستک دے وہ مسکرا کر اس کا استقبال کرتا ہے۔ منگتا اس کے در سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ دروازے کی چابی صرف اسی کے پاس ہے۔ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے ہمارے دل ہمارے بس میں نہیں ہیں۔ اس کی تلاش کو مقصودِ زندگی بنا لیا جائے تو سارے راستے اسی کی طرف لے جاتے ہیں۔

> ''تمھیں پتا ہے میں نے تمھیں کہاں کہاں ڈھونڈا؟ کس کس راستے پر۔ کس کس راہ میں۔ تمھیں کیسے پتا ہو، تمہاری کوئی ایک راہ تھوڑی ہے۔ کوئی ایک راستا کب تمھاری طرف آتا ہے۔ پھر تمہاری طرف نکلا ہوا میں کون سا اکیلا مسافر تھا۔ مجھے تو تمھارے سفر کی راہ میں ملے مسافر بھی انمول ملے۔ یہ تمہاری طرف آتی راہ کا کمال ہے۔ میرا اس میں کیا دخل ہے۔ دخل تو سب سے پہلے اس سفر میں دخول ہوتا ہے۔ اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ سارے اختیارات تیری راہ پہ پہلا قدم لیتے ہی نکل جاتے ہیں۔ تیری راہ کی پہچان ہی بے خودی ہے، بے اختیاری ہے، ایسی کیفیت جس میں خودی بے لگام نہیں ہوتی۔ اور اختیار نام کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔''(۳۳)

ابدال بیلا نے ناول کے کردار ''سیراں'' کی صورت میں مجاز سے حقیقت کے سفر کی ایک خوب صورت مثال پیش کی ہے۔ سیراں ابوالفضل سے محبت کرتی ہے اور اس محبت کی بھٹی میں جل کر کندن بن جاتی ہے۔ یوں اس کی دل کی آنکھ کو روشنی عطا ہو جاتی ہے۔ وہ ابوالفضل کے ریل گاڑی سے اُترنے اور اس کے بعد اس پر بیتنے والے واقعات گھر میں بیٹھ کر دیکھتے ہوئے ابوالفضل کی بیوی کو ساتھ ساتھ بتاتی جاتی ہے۔

> ''پھر چولہے پر توا رکھ کر بولی۔ بہن اب میں روٹی چڑھا دوں۔ وہ گاؤں کی نکڑ پر ٹانگے سے اتر کر کھڑے جیب سے پیسے نکال کے دے رہے ہیں اور ایک بچے کو بلا کر پوچھ رہے ہیں کہ سائیں بگو شاہ کدھر ہے، وہ اپنے ڈیرے پہ نہیں ہے نا، پتہ ہے انہیں سائیں کدھر گیا ہوا ہے۔ پوچھ اس لیے رہے ہیں کہ سائیں بگو شاہ بھی سن لے کہ وہ آئے کھڑے ہیں وہ عجیب عقیدت بھری سرشاری کی کیفیت میں آٹے کی کنالی میں سے پیڑے بنانے لگی۔ ابھی پہلی روٹی توے پہ اس نے نہیں ڈالی تھی کہ ایک دم اونچی آواز میں پکارنے کے انداز میں بولی، وہ تانگہ جا رہا ہے گٹھڑی تو اُٹھایئے اپنی۔''(۳۴)

وہ لوگ بہت نصیب والے ہوتے ہیں جو اس کا بھید پانے نکلتے ہیں اور دوسروں کے لیے ایک بھید بن جاتے ہیں۔ سائیں کی محبت میں پاگل زینب اپنے یار کے یار کا بھید پانے نکلی جو اس کے یار کو اس کا ہونے نہیں دے رہا تھا اور خود اس کی محبت میں فنا ہو کر اپنے ہوش گنوا بیٹھی۔ رات کے وقت وہ سائیں سے ملنے جاتی ہے۔ سائیں اسے کہتا ہے کہ میں تو صرف اپنے ''یار'' کا ہوں، کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ سائیں کا دوست ابوالفضل اسے چھوڑنے اس کے ساتھ گھر جاتا ہے مگر روشن ولی کی درگاہ پر پہنچ کر وہ سائیں کے یار کا بھید جاننے کا فیصلہ کرتی ہے اور خود سب بھلا کر اُس کی ہو جاتی ہے۔

> ''وہ پیر جھاڑ کے درگاہ کے اندر چلی گئی۔ کئی سال بیت گئے۔ وہ درگاہ سے باہر نہیں آئی۔ کئی بار سائیں درگاہ میں چوری چوری گیا، مگر زینب نے اُسے پہچانا ہی نہیں۔''(۳۵)

ابدال بیلا قاری پر تصوف کا یہ باریک نکتہ کھولتے ہیں کہ رب اور بندے کے درمیان کسی تیسرے کی موجودگی اصل میں رب اور انسان کے درمیان دوری پیدا کرتی ہے مگر جب ان میں سے تیسرا نکل جاتا ہے تو منزل تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ تیسرے کی جدائی کے درد میں جب روح تڑپتی ہے، انسان بے کل ہو جاتا ہے، اسے کوئی رستا نظر نہیں آتا تو اس وقت رب آگے بڑھ کے بندے کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

> ''درد بانٹنے والی ہستی جب ایسا درد بانٹنے پر تلی ہو جسے کم نہیں کرنا۔ تو وہ اسے کم نہیں ہونے دیتی۔ جس شخص کے میلے پیروں کو اس کے درد کے لیے چنا گیا ہو۔ اس کے نصیب میں وہ اتنی مہلت نہیں لکھتی کہ وہ چند دنوں کی فرصت نکال کے مڑے ہوئے ناخنوں کو نکلوا سکے۔ میں گائے، بھینس، بھیڑ، بکری ہوتا تو شاید میرا چرواہا ترس کھا لے میرا مڑا سینگ پکڑ کے کاٹ دیتا۔ میرے ٹیڑھے ناخن نکلوا دیتا۔ اب میں کیسے اپنے گڈریے سے اپنا دکھڑا کہوں۔ اسے سب دکھتا ہے۔ اس کے سامنے میں بھی بے زبان ہوں۔''(۳۶)

انسان اس مغالطے کا شکار رہتا ہے کہ ہر شے اس کی دسترس میں ہے اور وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس کے دل پر اُس کی چلتی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ دلوں کا مالک بھی صرف وہی ہے۔ وہ جس طرف چاہے دل کو پھیر دے۔ لوگ مجاز کی راہ پر سفر شروع کرتے ہیں۔ گوشت پوست کے کسی انسان پر دل ہار جاتے ہیں۔ محبت کی آگ میں جسم کا رواں رواں جل اُٹھتا ہے اور اس شخص کے بغیر جینا محال لگتا

ہے۔ مگر پھر مالکِ حقیقی اس تیسرے کو اپنے اور بندے کے درمیان سے نکال باہر کرتا ہے اور بندے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی محبت کا اسیر بنالیتا ہے۔ ''صاحباں''، ''سیراں'' اور ''زینب'' عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کے اس سفر کی خوب صورت ما بعد الطبیعیاتی مثالیں ہیں اور عقل اس بارے میں کوئی بھی رائے دینے سے لاچار ہے۔ ابدال بیلا نے عشق کی ان کہانیوں کی مدد سے خدا اور بندے کے تعلق پر بہت عمدہ اور عام فہم انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

ج۔ اللہ مختارِ کل:

مومن اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر رکھتا ہے۔ اس نے ایک ''کن'' کہا اور کائنات بنا ڈالی۔ تمام مخلوقات پیدا کیں اور اب اس کی مرضی ہے کہ مخلوق کے لیے جو چاہے تدبیر اختیار کرے۔ انسان اس کی مرضی کے سامنے بے بس ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے: ''اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔''(۳۷) وہ ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہِل سکتا۔ انسان جتنی مرضی کوشش کرلے اگر اس کی رضا شاملِ حال نہیں ہے تو انسان مجبور ہے اور اگر اس کی رضا شاملِ حال ہے تو راستے میں حائل کوئی بھی رکاوٹ انسان کا راستا نہیں روک سکتی۔ اسے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔ کائنات میں کھیلے جانے والے سارے کھیل وہ خود رچاتا ہے۔ سب کہانیاں اپنے قلم سے لکھتا ہے۔ اگلے پل کیا ہونا ہے صرف وہی جانتا ہے۔

> ''اگلے لمحوں کی کوئی عبارت ہم نہیں لکھتے، وہ ہمیں لکھتی ہے۔ اب تم اور میں رب کے قلم میں روشنائی کی طرح بھرے گئے ہیں۔ تو یہ ہے ہماری قسمت۔ دیکھیں لکھنے والا ہمیں کیا لکھتا ہے۔ کیسے بناتا ہے ہماری کہانی۔ کیا ہوتا ہے آگے؟''(۳۸)

انسان کی تقدیر میں جو روزِ ازل سے لکھ دیا گیا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ سارے معاملات پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ کہانی کا سارا اسکرپٹ پہلے لکھا جاتا ہے، اس کے بعد کردار چُنے جاتے ہیں۔ پھر ان سے مکالمے ادا کرائے جاتے ہیں۔ انسان کی ڈور کسی اور ذات کے ہاتھ میں ہے۔ سب اسی ذات کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان سارے معاملے میں لاعلم ہوتا ہے۔ بس کوئی ڈور ہِلاتا جاتا ہے اور پتلیاں ہلتی جاتی ہیں۔ ابدال بیلا قاری کی توجہ اس طرف دلواتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ان دونوں کو نہیں پتہ تھا، کہ وہ دونوں بے قصور ہیں۔ اصل کھیلنے والا کوئی اور ہے۔ جس کی ڈور سے بندھی دونوں پتلیاں ہیں۔ کب کس نے اٹھنا ہے۔ کس نے بیٹھنا

ہے۔ کہاں بیٹھنا ہے۔ یہ پتلی تماشے والا جانتا ہے۔ صاحباں نے وہیں پاوتر آستانے پر آنا تھا۔ سوڈی شاہ کے منہ میں اس نے ہی اپنے بول ڈالے تھے اور صاحباں کے سجے شیش محل میں ایستادہ ''میں'' کا بت توڑنے اسی نے فضل دین کو بھیجا تھا۔''(۳۹)

اس حقیقت سے سب آشنا ہیں کہ دنیا کا یہ کارخانہ اسی کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ کسی کی اتنی مجال نہیں کہ وہ اس کے کاموں میں مداخلت کرے۔ وہ ایک لمحے میں انسان کو اس کی اوقات یاد دلا دیتا ہے۔ ابدال بیلا بکری اور چارے کی مثال سے ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ دیکھو! کبھی اس کے ساتھ کوئی شرارت نہ کرنا، وہ ایک لمحے میں چارے کو بکری اور بکری کو چارہ بنا دیتا ہے۔ چارے کی دو مٹھیاں کھا کر چھری کے نیچے آنے میں بکری کو کوئی دیر نہیں لگتی۔ اس کی عمر صرف اتنی سی ہے۔ اصل قوت کا مالک اور سرچشمہ وہی ہے۔ ابدال بیلا ''تم'' سے مخاطب ہو کر اس ذات پاک کی قوت اور طاقت کے بارے میں کہتے ہیں۔

''اس میں تو ہر طاقت ہے۔ صرف وہی تو طاقت ور ہے۔ اس ارض و سماوات میں تم جو طاقت کا پرتو دیکھتی ہو، وہ اسی سے مستعار لی ہوئی امانت ہے۔ طاقت اور قوت کا اصل وارث اور مالک صرف وہی ایک ہے۔ اس میں ہر طاقت موجود ہے۔''(۴۰)

ہم سب کو تخلیق کرنے والی ذات وہی ہے۔ ہم سب اس کے بنائے ہوئے برتن ہیں۔ ان برتنوں کی شکل، صورت، ماہیت، قدر اور استعمال کے بارے میں صرف وہی علم رکھتا ہے۔ کون کپ ہے، کون لوٹا ہے، کون صراحی، اس سب سے صرف وہی واقف ہے۔ پلیٹ خود کو پیالی اور پیالی خود کو صراحی گمان کر لے تو یہ مغالطے پالنے کی صلاحیت بھی اسی نے دی ہے۔ درحقیقت ظروف اور کمہار والی مثال سے ابدال بیلا قاری کی فکری گرہیں کھولتے ہوئے اسے سمجھاتے ہیں کہ انسان خود کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہے اور خود کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اصل میں صرف رب کی ذات انسان کے ظاہر اور باطن کی سچائی سے واقف ہے۔ وہ کوزہ گر ہے۔ اس نے مٹی کے برتن بنا کر ان میں جان ڈال ڈی۔ مگر کون سا برتن کن خصوصیات کا مالک ہے اور کس برتن کو کیسے بنانا ہے۔ یہ اس کی ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

''یہ ہمارا لوگوں کا ہجوم بھی برتنوں کا ڈھیر ہے مٹی کے بنے پیالے پیالیوں، کنالیوں، گڑویوں، گھڑوں، مرتبانوں سے لدی ہوئی بھٹی۔ چاک پہ چڑھانے کے چکنی مٹی کے برتن اسی نے خود بنائے ہیں اور کچے برتنوں کی پختگی کے لیے تنور میں آگ بھڑکا کے اسی

نے رکھی ہے۔ کس برتن کو کتنا سیک دینا ہے۔ کتنی دیر تنور میں رکھنا ہے۔ یہ صرف وہ جانتا ہے۔ جس برتن کے نصیب میں زیادہ ٹھوکریں لکھی ہوں، جسے بار بار اٹھوا کے گرانا ہو، اسے وہ زیادہ دیر تک تنور میں رکھتا ہے۔ پوری طرح پکا کرتا ہے۔ یہ اب اس کے راز ہیں۔۔۔ اس کے چاک سے اتر کر بھی ہم اس کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ وہی ہمیں رکھتا ہے۔ جہاں ہمیں رکھے جانا ہوتا ہے۔ کس برتن میں اس نے کیا ڈالنا ہے، کیا رکھنا ہے، آسائش کے لیے بنایا گیا ہے وہ یا آرائش کے لیے۔ پیندا کس کا کھلا رکھنا ہے۔ حلق کس کا بڑا رکھنا ہے۔ کس کے پیٹ سے مٹی کھرچنی ہے، کس کے ماتھے پہ پھول پتیاں بنانی ہیں۔ یہ سارے اس کے کام ہیں۔''(۴۱)

ساری کائنات پر صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کی مطیع و فرماں بردار ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل کرتی ہے۔ فاصلے اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ تو پلک جھپکنے میں ہزارہا میل دور سے اپنے بندے سے تخت اُٹھوا کے دکھا دیتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے سامنے چُوں چراں کر سکے۔ اس نے ''کن'' کہا، کائنات بنی، ساتھ کائنات کے قوانین وجود میں آئے۔ قوانینِ فطرت اس کے تابع ہیں۔ یہ اختیار بھی اس کے پاس ہے کہ وہ جب چاہے اپنے قوانین معطل کر دے یا ان میں ترمیم کر دے۔

'' اپنے ہی سارے قوانین ایک ایک کر کے معطل بھی کر کے دکھا دیے۔ جب چاہا یا نہیں؟ سمندر کے اندر سے راہیں بنا کے دکھا دیں۔ لہروں کو دیواروں کی طرح روک کے کھڑا ہو گیا۔ گزار دیے اندر سے قافلے نہیں گزارے؟ آگ بڑی جلائی گئی تھی۔ امینڈ منٹ آگئی۔ ٹھنڈی ہو جا۔ وہ ٹھنڈی ہونے لگی۔ ساتھ حکم دیا۔ سلامتی کی حد تک ٹھنڈی ہونا۔''(۴۲)

ابدال بیلا اسلامی تاریخی واقعات کا حوالہ دے کر قاری کو اللہ تعالیٰ کی صفت ''القادر'' سے متعارف کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے، آقا ہے اور ہم سب اس کے غلام ہیں۔ بادشاہ کی مرضی ہے کہ وہ اپنی رعایا میں سے جسے جو چاہے عنایت کر دے۔ چاند کو دو ٹکڑے کرا دے، رسی کو سانپ بنا دے۔ کسی کے ہاتھ سے مردوں میں جان ڈال دے۔ سب اس رب کے احاطہ قدرت میں ہے۔

'' بھئی وہ بادشاہ ہے۔ رعایا کے ہجوم میں جس کے کندھے پہ چاہے اپنی مرضی کی لاٹھی رکھ دے۔ جس کے سر پہ چاہے کلغی لگا دے۔ کاندھے پہ پھول رکھ دے۔ ہیرے پہنا

دے۔ یا کانٹوں کا تاج دے دے۔ جو مرضی کسی کو دے۔ جو چاہے کسی سے لے لے۔ کسی کے ہاتھ پہ صبح کا سارا اجالا دھر دیا۔ کسی کی انگلی کی ایک جنبش سے چاند کو ٹکڑے کر دیا۔ کسی کے ہاتھ لگانے سے گئی سانسیں واپس آگئیں۔ کسی کے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی کو ایسا سانپ بنا دیا۔ جو سارے سانپوں کو کھا گیا۔ ہے نا سب اس کے اختیار میں۔"(۴۳)

اللہ کی قدرت اور اختیارات بیان کرنے کے بعد ابدال بیلا قاری کے دل میں اللہ پاک کی چاہت اور محبت کا جذبہ پروان چڑھاتے ہوئے اسے کہتے ہیں کہ گو سب اس کے اختیار میں ہے مگر ہاں! اگر تم کسی رعایت اور نرمی کے طلب گار ہو تو اس سے یاری لگالو۔ اسے اپنا دوست بنالو۔ جب وہ تمہارا ہو جائے گا تو اس کی ساری کائنات تمہارے قدموں میں ہو گی۔

"اگر کسی قانون میں رعایت چاہیے تو اس سے یاری لگا، جو قانون بنانے والا ہے۔ پانی کو کس نے ڈیوٹی دی ہوئی ہے۔ اس سے بات کر۔ اسے قوت ہے کہ جب چاہے اپنے ہی کسی قانون میں ترمیم کر دے۔ ایک لمحے کے لیے اسے معطل کر دے۔ بے باک اچھلتی سمندر لہروں کو اپنے کسی پیارے کی فرمائش پر چھری کی طرح کاٹ کے پہاڑوں کے روپ، روک کے درمیان میں رستہ دے دے۔ آگ کے جلتے الاؤ کو اپنے کسی دوست کے لیے پھولوں کا مہکتا جھولا بنادے۔ اپنی بنائی روحوں کو اپنے کسی چہیتے کے منہ میں ڈالے بول سے بلانے لگے۔ اپنے لاڈلے سے اپنی بنائی آسمان کی نشانی چاند کو دو ٹکڑے کرا دے۔ جو چاہے کر دے، کرادے۔ ہے کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا۔"(۴۴)

اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر شے پر محیط ہے۔ اس کے اختیارات لا محدود ہیں۔ ساری کائنات اس کی تابع ہے اور اس کے احکامات کی بجاآوری میں مصروف ہے۔ اس قادرِ مطلق نے تمام مخلوقات پیدا کیں اور انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔ کوزہ گر نے چاک پر رکھے اس برتن کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ گو انسان خود کو بہت کچھ سمجھتا ہے مگر صداقت تو اسی بات میں ہے کہ جس کہانی کا وہ کردار ہے، وہ کسی اور کی تحریر کردہ ہے، انسان تو اس دنیا میں آتا ہے۔ اپنا تفویض کردہ کردار ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس کٹھ پتلی کی ڈور اُس کے ہاتھ میں ہے جس نے کائنات کے سارے قوانین بنائے ہیں اور قوانین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے ان قوانین میں ترامیم کر کے انسانی عقل کو حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسان کو جو بھی

ملے گا اس کے در سے ملے گا، چنانچہ اس کی دوستی کے حصول کو زندگی کا مقصد بنالینا چاہیے۔

د۔ ورد و وظائف:

ورد وظائف اللہ کے نیک بندوں کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ نفس کی برائیوں سے چھٹکارا پانے، روحانی ترقی اور اللہ پاک کی محبت کے حصول کے لیے لوگ مختلف ورد وظائف کا سہارا لیتے ہیں۔ وظائف کا ورد انسان کو روحانی طور پر مضبوط بناتا ہے اور بندے اور اللہ پاک کے درمیان تعلق کی تجدیدِ نو کرتا ہے۔ صوفیا کرام کی زندگی میں ہمیں کئی اوراد و وظائف کا ذکر ملتا ہے جو وہ بلاناغہ پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ عام لوگ بھی روزمرہ میں مختلف کلمات کے ورد کو زندگی کا حصہ بنالیتے ہیں۔ ابدال بیلا نے ''دروازہ کھلتا ہے'' میں بھی ورد و وظائف اور ان کے فیوض و برکات کا ذکر کیا ہے۔ خیراتی شاہ، ابو لفضل اور سائیں بگو شاہ کے اصرار پر انہیں کلمہ شریف اور درود شریف میں کوئی ایک ایک چیز چننے کا کہتا ہے۔ سائیں بگو شاہ، خیراتی شاہ کی بات سن کر کلمہ شریف اور ابوالفضل درود شریف چنتا ہے۔ ان وظائف کی بدولت ان سے ماورائے عقل واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وظائف تطہیرِ نفس کے لیے دوا کا کام کرتے ہیں۔ اخلاقِ رذیلہ سے دوری ان وظائف کو پڑھنے کی لازمی شرط ہے۔ وظائف اسی صورت اثر دکھاتے ہیں جب ان کو کرنے والا ہر طرح کی برائی اور بے حیائی سے دور رہے۔ یوں اس کے نفس کو پاکی عطا ہوتی ہے اور اس کا دل خدا کا گھر بن جاتا ہے۔ کلمہ شریف اور درود شریف کی بدولت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ وظائف کی بدولت انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے اور وہ فقیری کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ سائیں اور ابوالفضل ان وظائف کی بدولت حاصل ہونے والی برکات کے بارے میں آپس میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''بائی تو نے بڑا ہتھ مارا ہے۔ فقیری کے چپے چپے میں تیری بڑی دور تک رسائی ہو گئی ہے۔ اللہ نے بڑی طاقت دی ہے تجھے۔ ابو الفضل یہ کہ کر گردن ستائش میں ہلانے لگا۔ جیسے دل ہی دل میں ماشااللہ کہ رہا ہو۔ سائیں کہنے لگا، تو سرکار دو عالم ﷺ کا عاشق ہے۔ تو کون سا کم ہے مجھ سے۔ تُو تو مشکل راہ پہ چلا ہے۔۔۔ بچے پالے۔ انہیں رزق حلال سے کھلایا، پڑھایا۔ جان ماری اور ادھر بھی اپنی تار سیدھی رکھی۔ عشق کا رنگ نہیں اترنے دیا۔ اپنا وظیفہ نہیں چھوڑا۔ اسی کے اندر اپنا آپ رچالیا۔''(۴۵)

انسان جب اللہ تعالیٰ کی ذات کے قرب کے راستے پر چلتا ہے تو اپنا سفر ''لا'' سے شروع کرتا ہے۔ ہر شے کی نفی کر کے، اپنے دل کو خالی کر کے انسان ''لاالہ'' تک پہنچتا ہے تو اسے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں ہے۔ایقان کی اس منزل پر پہنچ کر اسے ''محمد رسول اللہ ''تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ پھر اسے پاکیزگی عطا ہوتی ہے۔ بابے نور پوریے نے بگو شاہ کی ضد کے آگے ہار مان کر اسے کلمہ شریف کی رمز سمجھاتے ہوئے کہا:

''اچھا پتر پھر اپنا ڈبہ خالی کر، پہلے بول کچھ نہیں ہے، نہ اندر نہ باہر، ''لا'' سے سبق پڑھ۔ چھ مہینے بعد ''لا'' سے ''لاالہ ''تک سبق پہنچا۔ سال بعد اس کی زبان سے لاالہ اللہ نکلا۔ جب اللہ اس کے ہونٹوں سے نکل کے ٹھیک طرح سے خون میں ہضم ہو گیا۔ سر سے پیر تک پورا وجود پاوتر ہو گیا تو ''محمد رسول اللہ ﷺ ''تک دسترس ہو گئی۔''(۴۶)

کلمہ طیبہ کا ورد مذہب کی تخصیص کے بغیر انسان کے باطن کو روشن کر دیتا ہے اور دل کو نور سے بھر دیتا ہے۔ سائیں کے پاس ایک سکھ لڑکا آتا تھا۔ سائیں کو اس سے پیار ہو گیا اور اس نے اسے چوری چوری کلمہ پڑھنے کا ورد دے دیا۔ کلمے کی برکت سے اس لڑکے کا اندر روشنی سے بھر گیا۔ جس جسم میں کلمہ طیبہ کا ورود ہو جائے اس جسم کو کوئی آگ نہیں جلا سکتی۔ سکھ لڑکے کی پلیگ سے موت واقع ہو گئی تو آگ نے اس کے جسم کو جلانے سے انکار کر دیا۔

''لے گئے اس لڑکے کو وہ اپنے مرگھٹ۔ دیسی گھی کے کنستر خشک لکڑیوں کا ڈھیر۔ آگ لگائی، لگی نہیں۔ پھر لگائی، پھر بجھ گئی۔ تین دن وہ سارے مل کے لڑکے کو جلانے کی کوشش میں لگے رہے۔ لڑکے کے جسم کو کیا، اس کے کفن کو بھی چنگاری نہیں چھوئی۔ یہ ہوا کیا ان کے تو دماغ ہل گئے۔ صبح آگ کا بھانبڑ دیتے۔ شام تک لکڑیاں جلتی رہتیں، راکھ اکٹھی ہو جاتی، کوئلہ سلگتا رہتا۔ مگر اندر کی میت ہیرے کی طرح سالم چمکتی رہتی۔ وہ اسی طرح ٹھنڈے کا ٹھنڈے رہتا۔''(۴۷)

جب روح اندر کی روشنی کو طلب کرتی ہے تو رب کریم اس کے لیے خود ہی اپنا دروازہ کھول دیتا ہے۔ شانتی ایک سکھ لڑکی تھی۔ اس نے کلمہ طیبہ کا ورد صدر کی انگلی پکڑنے کے لیے کیا مگر اس کی لگن سچی تھی۔ کلمہ طیبہ کا ورد اس کا نصیب بنا گیا۔ جب ذکر دل کی دھڑکن میں رچ بس جاتا ہے تو قلب روشنی میں لپٹ جاتا ہے۔ پھر اس جہان میں دل نہیں لگتا، پھر اُس کے روشن گھر کی کسک کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ کلمہ طیبہ کے ورد نے شانتی کے اندر روشنیاں بھر دیں۔ جب اس کی ذات کے اندھیرے دور ہوتے ہیں، قلب روشنی سے منور ہوتا ہے تو ہر سمت نور ہی نور نظر آنے لگتا ہے۔ جب قلب پر مختلف کیفیات کا نزول ہوتا ہے تو انسان ان تجربات اور مشاہدات کو بیان کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ شانتی کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا تھا۔

''اسے جس روشنی کا سامنا تھا وہ اس کے سامنے تھوڑی تھی، وہ تو اس کے اندر سے لاٹیں مار رہی تھی۔ شروع شروع میں وہ اپنے خواب اور تجربے صدر کو سناتی رہی کہ کیسے آسماں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک وہ پینگ میں بیٹھ کے جھولتی پھرتی ہے۔ ستارے آسماں سے اتر اتر کے اس کے قدموں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ پھر اس کی پینگ کچھ اتنی اونچی ہو گئی کہ دیکھے ہوئے نظارے اس کے ہونٹوں پہ آ کے لرزنے لگتے، کہے نہ جاتے۔''(۴۸)

کلمہ طیبہ وہ پاک اسم ہے جو کوئی سچے دل کے ساتھ پڑھ لے اس پر ہر طرح کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ شانتی کے مرنے پر بھی ایسا ہوا۔ وہ محبت کی آگ میں جل چکی تھی اور دنیا کی آگ نے اس کے جسم کو جلانے سے انکار کر دیا۔

''شام کو شانتی کا باپو دیوا سنگھ، لیمپ اپنے کندھے پہ رکھ کے شانتی کو کھاٹ پہ ڈال کے شمشان گھاٹ لے گیا۔ ساری رات دیسی گھی کے ٹین لکڑیوں پہ ڈالتا رہا۔ تیلیاں جلا جلا آگ لگاتا رہا، آگ ہی نہ چلی، ماچسیں جیبوں سے ختم ہو گئیں۔ شانتی کے جسم پہ پڑی چادر کا ایک دھاگہ بھی نہ جلا۔''(۴۹)

اللہ تعالیٰ خود بھی اپنے نبی پاک ﷺ پر درود و سلام پڑھتا ہے اور ایمان والوں کو بھی ان پر درود و سلام پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ درود شریف کے ورد سے دل میں اللہ کے محبوب ﷺ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح قلبِ سلیم کا حصول ہر مومن کا مطمع نظر ہوتا ہے۔ سچے دل سے کلمہ طیبہ پڑھنے والے کا قلب سلیم ہو جاتا ہے اور وہ شخص ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یوں اس پر آگ حرام ہو جاتی ہے۔ قلب کی صفائی اور پاکیزگی کلمہ طیبہ اور درود شریف کی بدولت حاصل ہوتی ہے اور مذہب کی تخصیص کے بغیر جو سچے دل سے کلمے کے ورد کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے اس کی دنیا و آخرت سنور جاتی ہے اور اس کا باطن روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ سائیں بگو شاہ، ابو الفضل کے علاوہ سکھ لڑکا اور شانتی ایسے کردار ہیں جو کلمے کی برکات سے قاری کو احسن طریقے سے روشناس کراتے ہیں۔

ہ۔ ذات کی نفی:

اپنے اصل کی تلاش، اپنے ذات کے جوہر کی پہچان اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وجود کا مالک، وجود کے بھید ظاہر نہ کرے۔ اپنی تخلیق کا مقصد پہچان کر خدا کی رضا کی طلب کرنا، خدا کی خاص عطا ہے، جو

مخصوص روحوں کا مقدر بنتی ہے۔ جب انسان اپنی ذات کی نفی کر کے، اپنی ''میں'' کو مار کر ربِ کریم کی رضا میں راضی رہنا سیکھ جاتا ہے، اپنے دل اور محبت کو خدا کے لیے خالص کر لیتا ہے اور کائنات کے مالک کا غلام بن جاتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا غلام بن جاتا ہے۔ جب انسان خدا کے کاموں میں لگ جاتا ہے تو خدا اس کے کاموں میں لگ جاتا ہے۔ زمان و مکان کا التباس اُٹھ جاتا ہے۔ تصوف کے اس دقیق مابعد الطبیعیاتی نقطے کی وضاحت بہت خوب صورت انداز میں ابدال بیلا کے ہاں نظر آتی ہے۔ آپ اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتے ہیں کہ وقت پر دسترس حاصل کرنا ہر ذی روح کے بس کی بات نہیں ہے۔ وقت اس کا ہے جو وقت کے خالق کے ہاتھوں اپنا آپ گروی رکھ دے۔

> ''مگر وقت کی سوئی پیچھے گھمانے پر ہر کسی کو دسترس نہیں ہوتی۔ ہر کوئی وقت کے پروں سے پرانی اُڑانیں نہیں مانگ سکتا۔ مگر جو خود اپنے پر اتار کے اپنی اُڑانیں کسی کو رہن دے کے بیٹھا ہو، وقت اس سے بحث نہیں کرتا۔ وقت اسے اپنی طنابیں سونپ دیتا ہے کہ جیسے چاہے گھماؤ، بناؤ، سجاؤ۔''(۵۰)

خالق اور مخلوق کے درمیان حائل رکاوٹوں میں ایک بڑی رکاوٹ ''میں'' ہے۔ اپنی انا اور میں کے بت کو پاش پاش کرنے والا تسلیم و رضا کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اپنی ''میں'' کے محل کو گرا کر اس کی مخلوق سے محبت کر کے ہی ہم اس ذاتِ باری کی محبت حاصل کر سکتے ہیں۔ ''صاحباں'' نے اس حقیقت کا سراغ پالیا اور اپنے اندر کے میلے پن کو پہچان کر اپنی ''میں'' کی قربانی دی تو اُسے ''وہ'' مل گیا۔ گویا اپنی ذات کی نفی سے اس کی ذات کے اسرار کھلتے ہیں۔ سوڈی شاہ، صاحباں کو یہی بات سمجھاتے ہیں:

> ''بس ایک بار تُو نے اس کے نام کے لنگر کی بات کی۔ اس نے میرے منہ میں اپنے بول ڈال دیے۔ میرا کیا قصور ہے۔ اس کی لاڈلی ہے تو، وہی ہمیشہ جتاتا آیا ہے۔ تو نے میں میں کے کھیل میں، ''میں'' ہی ہار دی تو وہ کیوں نہ تیرے ہاتھ میں اپنی ڈوئی دیتا۔''(۵۱)

اُسے پانے کے لیے اپنی انا کے دائرے سے باہر آنا پڑتا ہے۔ تاکہ اُسے ''میں'' کا مکان خالی ملے اور وہ اس میں اپنی محبت کی جوت جلا سکے۔ جب اس کی طرف سفر کرنا ہے تو اپنی ''میں'' کے گھر سے باہر قدم نکالنا ہوں گے۔ ''میں'' کا مکان خالی ہو گا تو وہ ''تُو'' کا سنگھاسن بنے گا۔ گناہ گار سے گناہ گار شخص بھی جب کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو کلمہ اس کے اندر کی میل صاف کرتا ہے اور جب من کی سلیٹ

صاف ہو جاتی ہے اور اندر سے ساری میل کچیل اور میں نکل جاتی ہے تو رب کی ذات من کو اپنا مسکن بنا لیتی ہے۔ ہر دت سکھ سزائے موت کا قیدی اور ابوالفضل کا دوست ہے۔ وہ ابوالفضل سے کہتا ہے کہ مجھے پڑھا دو کلمہ مگر میرے من میں بہت میل ہے۔ اس پر ابوالفضل کہتا ہے:

''ہر دت، کالی سلیٹ سب سے اچھی ہوتی ہے کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اچھا پھر پڑھا دے کلمہ یار۔ یہ پڑھائیاں، دوسرا نہیں پڑھاتا، اپنا آپ اندر سے پڑھتا ہے پڑھنے کو پڑھے جانے والے بول تُو تو جانتا ہے جانتا ہے نہ تُو؟ پتہ تو ہے، پر اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے، بس کوئی نہیں ہے رب سوائے تیرے اللہ اور حضرت محمد ﷺ تیرے سچے نبی ہیں، آخری۔ اتنی سی بات ہے۔ مگر جب تک اندر کا برتن صاف نہ ہو جائے، اوپر سے دودھ نہیں اترتا میلے برتن میں کبھی کسی نے دودھ چویا ہے۔ بول، نہ بائی۔ بس پھر پانڈہ صاف کرنا ہے پہلے۔ لا کوئی نہیں ہے سوائے اس کے۔ پھر وہ آتا ہے اتر کے۔ ایسے نہیں۔ بائی بلا دے اسے، اندر خالی کر لیا ہے میں نے۔ اپنا آپ بھی نکال دیا ہے۔''(۵۲)

سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ سب کچھ اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان جب بے بس ہو کر، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے کہ سارے اختیارات رب سوہنے کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ہر معاملے میں لاچار ہے اور ایک خزاں رسیدہ شاخ کی مانند زوال کا شکار ہے تو اس کے اندر سے ''میں'' کا فتور نکل جاتا ہے۔ ساری اکڑفوں نکل جاتی ہے۔

''جب سارے اختیار کسی خزاں رسیدہ درخت کے پتوں کی طرح اک اک کر کے جھڑ جائیں۔ بچھڑ جائیں اور اپنا پورا وجود خزاں رت کا کوئی سہما ہوا ٹنڈ منڈ الجھی اجڑی شاخوں بھرا شجر بن جائے۔ ہاتھ خالی ہو جائیں، جن کی پہنچ میں ان کا آپس کا ساتھ بھی نہ ہو۔ خدا نہ کرے۔ کسی پر یہ لمحہ آئے کہ اجڑی ہوئی شاخ کو یہ گمان بھی نہ رہے کہ کبھی بہار آئے گی۔ ایسی بے بسی ہو۔ کوئی چوائس نہ ہو۔ کوئی آلٹرنیٹو نہ ہو۔ مگر جیتنا ہو۔ ہار کے بھی نہ ہارنا ہو۔ ایسی کشمکش ہو۔ تو اندر باہر کی خالی بستی میں اچانک اک طوفان آتا ہے۔ اک بھونچال جاگتا ہے۔ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے کی رت آتی ہے ایسا زلزلہ سر اُٹھاتا ہے کہ اندر باہر کی ساری بستی پہ چپکا ہوا ''میں'' کا فتور نکل جاتا ہے ''میں'' کا سارا جن کھسک

جاتا ہے۔انا کی ہوا سرک جاتی ہے۔''(۵۳)

ابدال بیلا قاری کے فکری دریچے وا کرتے ہوئے اسے اس حقیقتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔ جب انسان ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، درد اور تکلیف اس کی برداشت سے باہر ہو جاتے ہیں تو وہ بہت شدت اور بے چینی کے ساتھ اس ذاتِ اقدس کو آواز دیتا ہے۔ مدد کے لیے اسے پکارتا ہے تو اس موقع پر وہ اپنے ہونے کی دلیل دیتا ہے۔

''انا کے خالی خول سے پھر اک پکار اُٹھتی ہے ایک ایسی چیخ، جو کائنات کی تمام تر وسعتوں میں بیک وقت سنی جا سکتی ہے ڈوبتے جہاز کے مستول سے ایس او ایس کا سگنل نکلتا ہے سیو آور سول۔ روح کا روح کل سے ابلاغ ہوتا ہے۔ابلاغ بھی یہ کہ بس اب صرف ''تُو'' ہے۔نہ میں نہ میرے جیسا کوئی ذی روح۔ تو سن اور اپنے سننے کی دلیل دے میرے اختیار میں صرف یہ آخری چیخ ہے۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ خالی ہوئی اندر باہر کی بستی کا خلا پھر خود ''وہ'' آ کے بھرتا ہے۔شہ رگ میں رہنے ولا، موجود لمحے کو دائمی ابدیت میں لپیٹ کر اپنی مہر لگا دیتا ہے۔''(۵۴)

ابدال بیلا نے قاری کا دھیان بار بار اس حقیقت کی طرف دلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی ''میں'' اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اگر کوئی ''تُو'' کو پانے کا خواہش مند ہے تو اس کے لیے اپنے اندر سے ''میں'' کو نکالنا بے حد ضروری ہے۔ یہ ''میں'' کیسے نکلتی ہے۔اس بارے میں ہر شخص کی الگ کہانی ہے۔

''اندر کی ''میں'' نکالنے کی ہر ایک کی الگ کہانی ہے۔ گیس بھری سوڈے کی بوتل سے گیس نکالنے کے لیے اسی طرح کرنا پڑتا ہے۔ خوب پکڑ پکڑ کے اسے ہلایا جاتا ہے۔ ساری گیس ابل کے اڑ جاتی ہے۔ ساری ''میں'' نکل جاتی ہے۔اندر جو تھوڑا بہت سیال رہ جاتا ہے اس میں ''میں'' کی شوں شوں نہیں جاتی۔ تُو ہی تُو کی مٹھاس ہوتی ہے۔''(۵۵)

ساری مخلوق اس مختارِ کل کی مطیع و فرمانبردار ہے اور اپنے اپنے فرائض بخوبی نبھا رہی ہے۔اس پوری کائنات میں صرف انسان ایسی مخلوق ہے جو اس کی حکم عدولی کی جسارت کرتا ہے۔اس کی ''میں'' سانپ بن کر اس کے نفس پر سوار رہتی ہے اور ہر کسی کو ڈسنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔اسے اس زعم میں مبتلا کیے رکھتی ہے کہ میں بہت بڑی چیز ہوں۔ ''میں'' انسان کے اور خدا کے درمیان حائل ہوتی ہے۔

''مگر اس پوری کائنات میں تمھارے اور میرے لیے، ہم جیسے سب انسانوں کے لیے ایک خصوصی رعایت ہے۔ ہم اس کی ساری رعایا میں واحد ایسی مخلوق ہیں۔ جنہیں حکم عدولی کی اہلیت ہے اور ہم ہی اس کے لاڈلے ہیں۔ اسی لاڈلے پن کے احساس سے ہمارا دماغ خراب رہتا ہے۔ مانو نہ مانو، روٹی تو وہ دیتا ہے۔۔۔ سمجھتے ہیں تیس مار خان ہیں ہم۔ بڑی چیز ہیں، میں بڑا ہوں، ایک کہتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے، میں ہوں تم سے بڑا۔ میں، میں۔ جدھر دیکھو ادھر میں، میں۔ یہی زہر ہے ہمارے اندر کا۔ جو اندر سے ہمیں ہی ڈستا ہے۔ دوسروں کا بھی بڑا ناس مارتا ہے۔ سارے زمانے میں اس سے فساد ہے۔''(۵۶)

اپنی ذات کی نفی سے اس کی ذات کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ روشنی انسان کے اندر تب اترتی ہے جب اپنی ''میں'' مار کر اپنا آپ فنا کر دیا جائے۔ ابدال بیلا ''میں'' اور ''تم'' کے درمیان گفتگو کے ذریعے قاری کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ انسان فانی اشیا کی محبت میں جنوں انگیزی کی حالت میں ہوتا ہے مگر کوئی اور اس جنوں خیزی کے طوفان کا رُخ اپنی راہ کی طرف کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ ''میں''، ''تم'' سے کہتا ہے۔

''مجھے کیا خبر تھی کہ تمہارے دروازے کی اوٹ میں کوئی اور بیٹھا ہے۔ جسے شاید صرف یہ انتظار ہے کہ کب میرے خالی پن سے ''میں'' کا بھوت نکلے اور میرے بنائے ہوئے تیرے خاکے کے خدوخال میں گوشت پوست کی جگہ ایک ان دیکھی روشنی لے لے۔ وہ روشنی جو تمام موجودات کی ماں ہے۔ سورج اور چاند کی بھی۔ جو کسی ایسے ذرے کو نظر نہیں آتی جو یہ سمجھنے لگے کہ میں اپنی قوت سے چمک رہا ہوں۔''(۵۷)

دکھ، درد اور تکلیف کی شدت میں ہمیں اللہ پاک کی ذات کا آسرا ہوتا ہے۔ جب من کی میل نکال کے اپنی انا کی قربانی دی جائے اور دنیاوی محبوب نظروں سے اوجھل ہو جائے تو درد اور تکلیف میں لتھڑی روح باقی رہ جاتی ہے۔ روح کی آہ وزاری پر من کی صفائی شروع ہو جاتی ہے تو اس تک پہنچنے کا رستا نظر آجاتا ہے۔

''ساری کھیڈ اپنے میلے من کو صاف کرنے کی ہے۔۔۔ میں تو میلا بندہ ہوں تو روح میں اترتے دودھ کی باتیں مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ دیکھ میری روح کا سارا میل میری ''میں'' سے ہے۔ اس ''میں'' نے جب تک تجھے اپنے میلے پن سے، تیرے تن سمیت اپنے اندر من کا دھبا بنا کے رکھے رکھا، دودھ نہیں اُترا۔ جب ''تُو'' راہ سے ہٹی۔ تیرے

ہٹنے کا درد رہ گیا۔اس روح نے چیخیں ماریں۔اندر جھاڑو پھرنے لگا۔انا کے بھوت کی ساری غلاظت،آنسوؤں سے دھلنے لگی تو دودھ کی بوندا باندی شروع ہو گئی۔''(۵۸)

انسان کی ''میں'' اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔انسان کی زندگی میں سارا فساد میں کا مچایا ہوا ہے۔ ''میں'' کی بدولت انسان کے سر میں یہ سودا سمایا رہتا ہے کہ وہ سب سے افضل اور برتر ہے۔وہ بہت کمال کی چیز ہے،اس جیسا اور کوئی نہیں ہے۔وہ اپنے علاوہ باقی ہر کسی کو ارذل اور حقیر سمجھتا ہے۔انسان کا یہ گھمنڈ اور تکبر اسے ربِ کریم کی ذات سے دور رکھتا ہے۔خدا کو عجز وانکسار پسند ہے۔جب انسان اپنی ''میں'' کو ختم کر کے اپنے تکبر اور گھمنڈ کا گلا گھونٹ کر رب کے حضور سر بسجود ہوتا ہے تو عاجزی کے اس مقام پر رب سوہنا اپنا آپ اسے سونپ دیتا ہے۔جب دل سے ''میں'' کو نکال کے اسے ''تُو'' کے لیے خالی کر دیا جائے تو ''تُو'' اسے اپنا ٹھکانہ بنالیتا ہے اور انسان عرفانِ ذات کی بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔

و۔تزکیہ نفس:

اپنی ذات میں سے برائیوں کو ختم کر کے اچھائیوں کو پروان چڑھانا اہلِ تصوف کا پسندیدہ فعل ہے۔تصوف کی زبان میں اسے تزکیہ نفس کہتے ہیں۔تزکیہ نفس سے انسان توکل کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔فقیر کے دل میں ماسوا حق کسی چیز کی منشا اور طلب نہیں ہوتی۔اس کا دل دنیا میں نہیں لگتا۔متاعِ دنیا اور جاہِ دنیا سے محبت اس کے خمیر میں شامل نہیں ہوتی۔دنیا اس کی ٹھوکر پر ہوتی ہے۔ابدال بیلا نے ابوالفضل اور نواب عطا محمد خان کے ذریعے تصوف کے اس پہلو کی نشان دہی کی ہے۔ابوالفضل انگریز کا ملازم ہوتا ہے اور نواب صاحب،لاٹ صاحب کے دوست۔نواب صاحب ابوالفضل کی خدمت گزاری سے متاثر ہو کر اسے انعام عطا کرتے ہیں۔اس موقع پر ابوالفضل کا ردِ عمل قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ ایک صوفی منش آدمی ہے اور اس کے نزدیک انعام اور مال و دولت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ابوالفضل،نواب صاحب سے کہتا ہے:

''آپ مرغابیوں کے شکار کی آڑ میں اپنے غلاموں کی گنتی بڑھانے آئے ہیں۔میرا مول لگا دیا ہے۔یہ پانچ تھیلیاں میری قیمت ہیں؟میری ضرورتیں بہت چھوٹی ہیں۔تھوڑی ہیں۔معافی چاہتا ہوں سرکار۔میں بکاؤ چیز نہیں ہوں۔یہ کہ کر ابوالفضل اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے رونے لگا۔دریا میں سناٹا چھا گیا۔''(۵۹)

فقیر کا دل ہر طرح کے لالچ اور طمع سے پاک ہوتا ہے۔اس کے سامنے لعل و جواہرات کے ڈھیر بھی لگے ہوں تو وہ ان پر نگاہ نہیں ڈالتا۔ بد دیانتی سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ایمان داری اس کی فطرت کا خاصہ ہوتی ہے۔وہ مال و متاع دیکھ کر بھی خدا سے خوف کھاتا ہے اور ایمان داری کا مظاہرہ کرتا ہے یوں وہ اپنے نفس کے گھوڑے کو ایمانداری کے چابک سے زیر کر لیتا ہے۔ابدال بیلا نے ناول کے باب ابوالفضل اور فضل میں اس رمز کو آشکار کیا ہے۔ابوالفضل کو نہر کنارے زیورات سے بھری ہوئی ایک بانسری ملی۔ دور دور تک کوئی بندہ بشر نہیں تھا۔اسے تو ویرانے میں خزانہ مل گیا۔ وہ چاہتا تو یہ زیورات اپنے پاس رکھ سکتا تھا مگر اس نے ایمانداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے زیورات مالک تک پہنچا دیے۔

> ''ابوالفضل نے اپنی قمیص اوپر کر کے کمر سے بندھی بانسری کا سرا قمیص کے اندر ہی اندر کھول کے باہر کھینچا تو لالہ دیکھ کے دھپ سے مٹی کے تودے کی طرح ان کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ابوالفضل نے بانسری اس کی بانہوں میں لٹکا دی۔اور نیچے لالہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔لالہ رونا شروع ہو گیا۔وہ کبھی بانسری کو بازوؤں میں پکڑے کبھی ابوالفضل کے بازوؤں میں تڑپے۔تڑپتے تڑپتے کبھی اس کے ہاتھ اور کلائیاں چومنے لگے۔''(۶۰)

انسان کا نفس اسے برائی پر اکساتا ہے مگر جو نفس پر قابو پا لیتا ہے اسے رب کا ساتھ اور محبت نصیب ہو جاتی ہے۔خدا کے نیک بندے ہر موقع پر نفس کے سرکش گھوڑے کو قابو رکھتے ہیں۔خاص طور پر تنہائی میں۔ ان کے دل میں یہ خوف جاگزیں ہوتا ہے کہ چاہے کوئی نہ دیکھ رہا ہو اللہ پاک کی ذات ہمیں دیکھ رہی ہے۔ ابدال بیلا نے دلچسپ انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔صاحباں اور فضل دین ساری رات ایک کمرے میں رہتے ہیں مگر فضل دین کا ایمان ایک پل کے لیے نہیں ڈگمگاتا۔کیونکہ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ کوئی اور چاہے موجود نہ ہو، رب تعالیٰ کی ذات موجود ہے۔

> ''صبح ہوتے ہی صاحباں فضل دین کے پیروں میں سر دے کے گر گئی۔روتے ہوئے بولی، میں تو اپنے آپ کو ایسی تلوار بنا کے جی رہی تھی جس نے چار ضلعوں کا کوئی بڑا بت نہیں چھوڑا، جسے پاش پاش نہ کر دیا ہو۔تم کس مٹی کے بنے ہو جس نے میری تلوار کی انی میرے کلیجے کے آر پار کر دی ہے۔خود ٹس سے مس نہیں ہوئے تمہیں کون منع کر رہا ہے؟ کس کا کہا مان رہے ہو؟ ہے، وہ مجھے دیکھے جا رہا ہے۔۔۔ادھر کون ہے تیرے

میرے سوا، ہے، تیسرا ہے! کون؟ فضل دین نے اپنی انگلی اُٹھا کے چاروں طرف گھمائی پھر اوپر کھڑی کر دی۔ بولا، اللہ ہے۔ اس کی نگہ سے چھپالو، تو جو کہو گی کروں گا۔"(۶۱)

انسان کے نفس کو پاکیزگی اسوہ حسنہ کی پیروی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسوہ حسنہ کی پیروی کامل ایمان کی نشانی ہے۔ تصوف کی بنیاد اخلاقی اقدار پر ہے۔ ابدال بیلا براہِ راست تصوف کا درس نہیں دیتے بلکہ بالواسطہ طور پر چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے قاری کا دھیان اخلاقیات کی طرف دلاتے ہیں۔ ہمارے مذہب اسلام کی تعلیمات اخلاقی اقدار پر سختی سے کاربند ہونے کا درس دیتی ہیں۔ نیز ہم ایسے نبی پاک ﷺ کی امت ہیں جن کے دشمن بھی ان کی ایمانداری اور دیانتداری کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ابوالفضل، لالہ جی کو زیورات کی تھیلی لوٹاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ

"ہمیں خیانت کی اجازت نہیں ہے ہم جن کا کلمہ پڑھتے ہیں وہ ﷺ امانت دار تھے۔ میری کیا مجال ہے حکم عدولی کی۔ یہ تو ان ﷺ کا ذرا سا حکم مانا ہے میں نے، آپ نے مجھے پتہ نہیں کیا کیا کہ دیا۔ بندے سے بھگوان بنا دیا۔ ذرا انہیں ﷺ تو سوچیں جن ﷺ کا یہ حکم ہے۔ جو ﷺ ہیں ہی سراپا سچ، امین، امانت دار، سارے جہانوں کے لیے رحمت ﷺ۔"(۶۲)

اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے بے پناہ پیار ہے۔ اللہ کے نیک لوگ اللہ کی مخلوق کی خدمت کو فرض سمجھتے ہیں تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو۔ اللہ پاک کی ذات اپنی مخلوق کی خدمت کے بدلے میں انسان کو نوازتی ہے۔ ابوالفضل اوور سئیر کی گھوڑی کی خدمت کرتا تھا اور بدلے میں اسے علم کی دولت حاصل ہوئی۔ ابدال بیلا قاری کا دھیان جانوروں کے ساتھ ساتھ انسانوں کی خدمت کی طرف بھی دلاتے ہیں کہ اگر خدا کی بندوں کی خدمت کی جائے تو بدلے میں خدا کی ذات کتنا نوازے گی۔

"جس اوور سئیر کی وہ گھوڑی چراتا تھا، مالش کرتا تھا، اسی کے سامنے قاعدہ لے کر بیٹھ جاتا۔ اردو، فارسی دونوں زبانیں سیکھ گیا۔ گھوڑی کی سیوا نے جاہل سے عالم بنا دیا۔ سیوا کرنے سے زیادہ علمی کام کوئی ہے ہی نہیں۔ سیوا کرنے سے تو علم کے وہ دروازے کھلتے ہیں جو جاگتی حسوں سے محسوس ہی نہیں کیے جا سکتے۔ ایک بے زبان گھوڑی کی سیوا کرنے کے اگر اتنے انعام ہو سکتے ہیں تو کسی "قادر الکلام" انسان کی سیوا کیا رنگ نہیں لا سکتی۔"(۶۳)

ابدال بیلا نے علامتی انداز میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ انسان کا نفس تمام برائیوں کی جڑ ہے۔اپنے نفس کو ہر شر اور برائی سے بچانے والا ہی نروان حاصل کر سکتا ہے۔ برما کے جنگل میں صدر کی ملاقات حمیدے سے ہوتی ہے جو کہ بھکشو کے روپ میں ہے۔ حمید، صدر کو بدھ مت کے فلسفے کے بارے میں بتاتا ہے۔ دونوں بیٹھ کے مچھلی اور اُبلے چاول کھاتے ہیں۔تب حمید، صدر سے کہتا ہے کہ

> ''کانٹے تو مچھلی کے ساتھ لازم ہیں یار۔ میں تو کھاتا رہا ہوں مچھلی ادھر، کانٹے ٹٹول لیتا ہوں۔ دیکھ موٹے کانٹے ہیں۔ تو قدرت کا نظام دیکھ، جس مچھلی کے پیٹ میں کانٹے ہوں اسی کو ڈوری سے کانٹا لگا کے پکڑا جاتا ہے تو اپنے اندر کے کانٹے ایک ایک کر کے نکال دے۔ باہر کر دے، تو کسی کو پکڑائی ہی نہ دے گا۔ پکڑا ہی نہیں جائے گا۔ مکت ہو جائے گا۔ تجھے نروان مل جائے گا۔''(۶۴)

یعنی جب تک نفس میں شر موجود ہے، انسان برائی کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ اگر نفس کی اصلاح کر لی جائے تو انسان کسی برائی کی پکڑ میں نہیں آسکتا۔ اس کے نصیب میں پھر خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ ندامت اور پچھتاوے کے آنسو انسان کا مقدر سنوار دیتے ہیں۔ دروازہ ان خوش نصیب لوگوں کے لیے کھلتا ہے جو جھولی پھیلا کر اس کے دروازے کے سامنے سر بہ زانو ہوتے ہیں۔ ابدال بیلا دنیا کی لذتوں اور محبتوں کو دل نکال کر اپنا دھیان صرف اسی ایک ذات کی طرف کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ ''میں''، ''تم'' سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

> ''تم میرے من میں اس وقت تک میخ تھی۔ جب تک تیرے خیال کے ساتھ تیرا تن جڑا ہوا تھا۔ اب اس سے بے نیازی کی منزل پہ پہنچا ہوں تو اپنے خدوخال کے ساتھ تُو مجھے نظر ہی نہیں آتی۔ دستک تو میں اب بھی دیتا ہوں عادت جو بنالی ہے۔ دروازہ تو ابھی تک بند نظر آتا ہے۔ پتہ نہیں کسے مجھ پر ترس آگیا ہے کہ لگتا ہے، دروازہ کھلنے والا ہے۔ میں تو مدت سے اس دروازے کی چوکھٹ پہ بیٹھا ہوں۔ اسے کھڑکائے جاتا ہوں۔ پہلے ہاتھ سے کھڑکاتا تھا، بڑا کھڑکا ہوتا تھا۔ اب جسم کے ہاتھوں کی جگہ روح کی سرسراہٹ نے لے لی ہے۔ میرا لہو میری ہی شہ رگ کے روبرو دوزانو ہوا بیٹھا ہے۔ آنکھوں کی دہلیز پہ آنسوؤں کی دستک ہے۔''(۶۵)

اسلام ہمیں برائی سے باز آنے اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ نفس انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ اسے برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ اسے گناہ کی آلودگیوں اور

آلائشوں سے دور رکھے۔جب انسان اپنے نفس کا تزکیہ کر لیتا ہے اور اسے تمام آلائشوں سے پاک کر لیتا ہے تو متقی اور پرہیز گار بن جاتا ہے۔مال و دولت اور دنیا کی محبت اس کے دل سے نکل جاتی ہے وہ اخلاقی اقدار کی پابندی کرتا ہے۔اس کی خلوت اور جلوت دونوں پاکیزہ ہوتی ہیں۔اسوہ حسنہ کی پیروی کی بدولت وہ تمام اخلاقِ رذیلہ سے دور ہو جاتا ہے۔جب نفس کو پاکیزگی عطا ہوتی ہے تو قلب منور ہو جاتا ہے۔روح نشہ الفت سے سرشار ہو جاتی ہے اور انسان کو اس دروازے تک رسائی مل جاتی ہے جہاں دی جانے والی ایک دستک مقدر سنوار دیتی ہے۔

ز۔خیر و شر کی آویزش:

انسان جب اپنے آپ کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کر کے اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالیتا ہے اور اس کی رضا کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے تو اسے اللہ کی طرف سے طاقت عطا کر دی جاتی ہے۔مگر بعض اوقات انسان میں اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ اس طاقت اور عطا کو سنبھال سکے۔اس کے اندر موجود شر، خیر پر غالب آجاتا ہے اور وہ اپنے غیض و غضب سے مخلوقِ خدا کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتا ہے۔خیر و شر کی کشمکش انسانی سرشت میں داخل ہے۔''دروازہ کھلتا ہے''میں خیر و شر کا یہ عنصر بھی موجود ہے۔ناول کے باب ''صاحباں''میں سوڈی شاہ اور ایک فقیر کا واقعہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ملنے والی طاقت ہر شخص سنبھال نہیں پاتا۔

> ''عین چوراہے بیچ ایک سوکھا سا چیتھڑوں میں ملبوس ایک فقیر کھڑا تھا۔ایک بازو اس نے کھولا ہوا تھا اور اپنی مٹھی کو کھول کر گھمانے والا تھا کہ سوڈی شاہ نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔اس فقیر نے سوڈی شاہ کو دیکھا تو دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا چہرے سے خون جیسے سارا نچڑ گیا۔کپکپی سی لگ گئی۔سوڈی شاہ نے اس کا بازو کھینچ کے پیچھے کیا اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے اچھی طرح اپنی طرف متوجہ کر کے کہا اوئے، پھلور میں تو میری ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔تم اسے کیوں غرق کرنے لگے تھے۔''(۶۶)

فقیر کے روٹی کے سوال پر دکان والے نے اسے دھتکار دیا۔فقیر سے یہ ذلت برداشت نہ ہوئی اور اس کے نفس میں موجود شر کے مادے نے خیر کو زیر کر لیا اور وہ پوری بستی کو تباہ کرنے ہی لگا تھا کہ عین وقت پر سوڈی شاہ کو خبر ہو گئی اور اس نے فقیر کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اس کی ساری طاقت سلب کر لی۔تصوف

مخلوقِ خدا سے محبت کا درس دیتا ہے اور اگر کوئی اس راہ پہ چلتے ہوئے خدا کی مخلوق کو گزند پہنچانے کی کوشش کرے تو وہ راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔

''وہ فقیر وہیں ڈیرے پر بیٹھا رہتا، وہیں بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ سوڈی شاہ نے اسے معاف نہیں کیا، وہ جب جب اس کی منتیں کرتا، شاہ جی اسے کہتے تو کم ظرف ہے۔ تیرے پیالے میں اتنی جگہ نہیں جتنی ہوس ہے۔''(۶۷)

اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے بے حد محبت رکھتا ہے۔ اگر کوئی اس کی طرف ایک قدم چل کر آتا ہے تو وہ اس کی طرف دس قدم چل کر جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اطاعت گزاری کا صلہ دیتا ہے۔ جو مانگتا ہے اسے ملتا ہے۔ جب انسان اپنے نفس کو زیر کر لیتا ہے تو اسے کچھ طاقتیں عطا ہوتی ہیں۔ اب یہ اس کا ظرف ہے کہ وہ ان طاقتوں کا استعمال کیسے کرتا ہے۔ اگر تو وہ تعمیری مقاصد کے لیے کرتا ہے تو بہت خوب۔ البتہ تخریبی مقاصد کے لیے کیا جانے والا استعمال اس کی راہ کھوٹی کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ کی ذات نہ صرف طاقت چھین لیتی ہے بلکہ اس کا انجام بھی بہت برا اور بھیانک ہوتا ہے۔

ح۔ کشف:

صوفیانہ عناصر میں کشف بھی ایک اہم عنصر ہے۔ اس کے معنی پردہ اُٹھانے کے ہیں۔ یہ سالک کو خواب کے ذریعے یا بیداری کی حالت میں اللہ کی طرف سے مستقبل میں ہونے والے واقعات کے علم ہو جانے کا نام ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' میں ایسے کردار موجود ہیں جو صاحبِ کشف ہیں اور انہیں ہونے والی ان ہونیوں کے بارے میں خبر ہو جاتی ہے۔ مثلاً سوڈی شاہ کو ایک سکھ جوان کو پیش آنے والے حادثے کا قبل از وقت علم ہو جاتا ہے اور وہ اسے اس حادثے سے بچا لیتا ہے۔

''شاہ جی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے آہستگی سے بولے دیکھ میرا چن، غصے نہ ہو تو کسی خوش بخت کا پتر معلوم ہوتا ہے، سوہنا جوان ہے، تیرے بیلوں کی جوڑی بھی بڑی سوہنی ہے۔ تجھے یہاں سڑک پر جاتے دیکھا تو ڈیڑھ گھنٹے بعد جو تیرے ساتھ ہونا تھا وہ نظر آ گیا۔ میں نے بھاگ کے تجھے روک دیا، اور دعا کرنے بیٹھ گیا۔ وہ بُرا سمے تھا۔ گزر گیا۔ جا اب میرا پُتر۔ تجھے ساتوں خیریں۔۔۔ پُتر یہی منظر دیکھ کے میں نے

تمھیں روکا تھا، یہ ہونا ہی تھا، مگر نہ روکتا تو دریا کے پُل کے اوپر ہونا تھا۔ چل میر اپُتر، اب چل۔''(۶۸)

''دروازہ کھلتا ہے'' کے باب ''ابوالفضل''، میں درود شریف کے وظیفے کی بدولت ابوالفضل کو ہونے والی باتوں کا پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔ کس کے ساتھ کیا ہونا ہے، کیا حادثہ پیش آنا ہے، کون کس کو کس بات کا کیا جواب دے گا۔ اس سب کے بارے میں اسے پہلے سے علم ہوتا تھا۔ روپڑ میں بڑی نہر پر ہونے والے حادثے اور اس کی نتیجے میں ہونی والی اموات کے بارے میں اس نے پہلے سے بتادیا تھا:

''بس پھر کیا تھا۔ عین وہی فلم چل پڑی۔ جو جو خواب میں دیکھا تھا وہی ہوا۔ ایک بندہ ادھر پھاٹک کی گراریوں میں گر گیا گراریاں ایک کھڑاک سے کھلیں۔۔۔ چوبیس میں سے تئیس بچ گئے۔ ان سب نے حادثے سے پہلے حادثے کا پورا منظر ابوالفضل سے سنا تھا۔ ہر بات اس نے بتا دی تھی۔ پوری تفصیل سنادی تھی۔ کدھر کدھر گراریاں اُڑ کے جائیں گی۔ کتنے بندے دریا میں کریں گے۔ کتنے سڑک پر۔''(۶۹)

کشف روح کا معاملہ ہے اس میں جسم کا کوئی عمل دخل نہیں۔ سب کیفیات روح پر وارد ہوتی ہیں۔ جب روح اور دل اللہ کی وحدانیت اور توحید کا نغمہ گانے لگے اور اس کے محبوب ﷺ کی محبت رگ رگ میں سرایت کر جائے تو روح کی آنکھ سے غیب کی خبریں ملنے لگ جاتی ہیں۔ ابوالفضل دورد شریف کا ورد کرتا تھا جس کی بدولت اس کو مستقبل میں ہونے والے واقعات کی اطلاع ملنے لگی۔ انگریز افسر جب بڑی نہر کے حادثے کے بارے میں انکوائری کرنے آیا تو اسے حادثے کے بارے میں ابوالفضل کے پہلے سے باخبر ہونے کا علم ہوا۔ انگریز افسر کے استفسار پر ابوالفضل نے بتایا:

''پتہ نہیں جی، یہ ان آنکھوں کے دیکھے کا ہی منظر ہوتا لیکن دکھتا کسی اور آنکھوں سے ہے نیند میں؟ کہ خواب میں کہ لیں۔ کوئی آواز بھی سنتے ہو کانوں سے؟ کانوں کے سننے والی آواز ہی ہوتی ہے مگر وہ کانوں کے بجائے اندر کہیں پوری روح میں گونجتی ہے۔ پتہ نہیں اسے سننے کے کان کدھر ہیں؟ کوئی آکے بتاتا بھی ہے؟ جی کہیں کچھ بابے سے بھی آتے ہیں خواب میں، جیسے روح روح کو ملتی ہے۔ یہ جسم والی حس وہاں کام کرتی نظر نہیں آتی۔''(۷۰)

اپنا آپ اپنے رب کے حوالے کرنے والے ان حقیقتوں سے بھی آشنا ہو جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں کوئی عام شخص کبھی نہیں جان پاتا۔ بگو شاہ سے یہ وعدہ کرنا کہ میں اپنی موت سے ایک رات قبل تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا ابوالفضل کے کشف کی ایک روشن مثال ہے۔

> ''اچھا۔ پھر مجھ سے ایک وعدہ کر۔ سائیں بگو شاہ بولا۔ بول بائی۔ ابوالفضل روٹی چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے وعدہ کر کہ جب تیرا آخری وقت آئے گا تو، تُو ادھر، میرے پاس پہنچے گا۔ سائیں بگو شاہ نے چٹائی پہ ہاتھ مار کے کہا۔ ایک لمحے کے لیے ابوالفضل نے آنکھیں میچ کے جیسے کسی سے کچھ پوچھا ہو اور پھر آنکھیں کھول کے مسکرا کے بولا پہنچ جاؤں گا۔ ان شااللہ پہنچوں گا ایک رات پہلے۔''(۱۷)

اسی طرح دور بیٹھ کر بھی ابوالفضل کو، سائیں بگو شاہ کے آنے اور اسے راہ نہ ملنے کی خبر ہو جاتی ہے اور وہ فضل سے کہتا ہے کہ بھاگ کر جاؤ اور تھوہر کے پیچھے سے اپنے تایا کو لے آؤ۔ تھوہر گھنا ہے اور اسے راستا نہیں مل رہا۔ سائیں بگو شاہ بھی کشف کے ذریعے اس بات سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس کا بلاوہ کب آئے گا۔ وہ فضل دین سے کہتا ہے کہ تم جہاں بھی ہوئے تمھیں اس بارے میں ایک دن پہلے اطلاع مل جائے گی۔ تم آجانا، میں نے تیرے ہاتھوں ہی مٹی میں اترنا ہے۔

اللہ کے نیک لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر بات مانتے ہیں اور بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کی ہر بات مانتا اور ہر دعا قبول فرماتا ہے۔ اللہ کے دوست انسان کا نصیب پڑھ سکتے ہیں۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' میں ابدال بیلا نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ گوپال سنگھ کی اولاد نہیں ہوتی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ ایک مسلمان بابا کے پاس جاتا ہے، جس کا ایک قبرستان میں ڈیرا ہوتا ہے۔ گوپال سنگھ بار بار التجا کرتے ہوئے پوچھتا ہے کہ میرے نصیب میں کوئی بیٹا بیٹی ہے یا نہیں۔

> ''میرے نصیب میں کوئی پتر پتری ہے۔ بابا؟ بابا، اس کا سوال سن کر ہنس پڑا۔ ہنستے ہنستے بولا، اوئے اس کے لکھے نصیب میں کدھر سے پڑھ کے بولوں، میں تو چٹا ان پڑھ ہوں، ایک صرف اسی کا نام پڑھا ہے تو مجھے کدھر پڑھنے ڈال رہا ہے۔ بابا آپ پڑھ سکتے ہیں۔ ہاں۔۔۔ آپ جیتے جی مر کے اپنے رب کو جی رہے ہیں۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے آپ اس کا لکھا نہ پڑھیں۔ کیسے مان لوں کہ وہ آپ کا کہا نہ سنے۔ بابا گوپال سنگھ جوشی کی باتیں

خاموشی سے سنتا رہا۔ ساری بات سن کے بابا کے پورے وجود میں سر سے پاؤں تک ارتعاش سا ہونے لگا۔ جیسے اس کے اندر کوئی بھونچال آیا ہو۔ بابا کا رنگ دیے کی پیلی روشنی سے بھی زیادہ پیلا ہو گیا۔ جسم ڈھیلا ہو گیا۔ اس نے اپنے گڑھے کی کچی دیوار سے ٹیک لگائی اور جھکی ہوئی نظروں سے گوپال سنگھ جوشی کو دیکھے بغیر آہستگی سے بولا۔ جا، میرا اللہ تجھے بیٹی دے گا۔"(۷۲)

اللہ کے نیک لوگوں کی نگاہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ سائیں بگو شاہ نے ہندوستان میں بیٹھ کے چندر کور کو ولایت سے آنے والے سرون کی آمد کے اوقات کے بارے میں حرف بہ حرف صحیح بتا دیا۔

"پتر وہ آرہا ہے ادھر بحری جہاز پہ بیٹھ کے۔ ڈھائی مہینے بعد کراچی اُترے گا۔ پھر ڈیڑھ دو دن بعد پہنچ جائے گا تیرے پاس۔ تیرے لیے اس نے چھ سو روپے بھی منی آڈر کیے ہوئے ہیں کہ رہا تھا پندرہ بیس دن لگیں گے منی آڈر پہنچنے میں۔"(۷۳)

اللہ کا کرم ہو تو بصارت کو بصیرت حاصل ہوتی ہے اور انسان ہونیاں قبل از وقت دیکھ لیتا ہے۔ سائیں نے بھی کوئی وظیفہ پڑھا اس کے بعد سے اس پر قدرت کے راز منکشف ہونے لگے۔

"ہوا یوں کہ سائیں نے اللہ جانے کون سا وظیفہ پڑھ لیا، کہ اگلے ایک دو دن بستی میں جو اونچ نیچ ہونی ہوتی، وہ اسے نظر آجاتی۔ پلیگ سے پہلے تو اکثر یہ فرحت بخش تھا۔ مگر پلیگ کے دنوں میں اسے یہی نظر آتا، فلاں گھر کے صحن میں دو جنازے پڑے ہیں۔ فلاں کے گھر میں تین۔۔۔ خواب میں ہر روز دو روشن سائے سے آکے کچھ کہ جاتے، اشارے سے مرنے والے کا چہرہ دکھا جاتے۔ جنازے زیادہ ہوتے تو انگلیاں لہرا کے گن کے گنا جاتے۔ ایک کے ہاتھ میں سیاہی بھری کونڈی سی ہوتی، دوسرے کے ہاتھ میں مہر سی ہوتی۔ مہر والا، کونڈی میں بھگو کے مہر جس کے سینے پہ لگاتا، اگلے دن سائیں اس کی فاتحہ پڑھنے والوں میں جا بیٹھتا۔"(۷۴)

صدر، شیر خان کے نام سے آٹھ سال سے سلیمان خیل کے علاقے میں رہ رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے تمام خاندان والے ہجرت کے دوران کٹ مرے ہیں۔ دوسری طرف صدر کے بھائی اس کی تلاش میں تھے۔ اس قبیلے میں سرخ فقیر کے نام سے ایک بزرگ رہتے تھے۔ ان پر اللہ کی طرف سے تمام حقیقتِ حال

منکشف ہوتی ہے اور وہ اپنے علم کی مدد سے صدر کی مدد کرتے ہیں۔

''ہمیں غوث اعظم کی عدالت سے حکم ملا ہے کہ تمہیں بلا کر کہ دیں اور تیرے کنبے کا پتا تجھے سمجھا کے واپس بھیج دیں۔ سرکار، میرا پورا کنبہ ادھر سے آتے ہوئے راہ میں کٹ گیا تھا۔ نہیں، وہ سارے زندہ ہیں اور تیرے منتظر ہیں۔ کہاں؟ ہمیں ادھر کے شہروں کے نام پتے پڑھنے نہیں آتے۔ تو پڑھا لکھا ہے۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کے پڑھ لینا تسلی کر لینا۔ اب لیٹ جایئیں۔ صدر نے پاؤں پسارے تو سرخ فقیر نے اپنے کندھے سے چادر اُٹھا کے اس کی طرف پھینکی۔ چادر ہوا میں اچھل کے اس کے اوپر تن کے دھیرے دھیرے گری اور ساتھ ہی صدر سو گیا۔ خواب میں اس کے بہن بھائی جہاں جہاں تھے وہیں پورے محلِ وقوع کے ساتھ اسے ایسے نظر آئے کہ اس نے ہر راہ بھی دیکھ لی۔ گھروں کے باہر دروازوں پہ لکھا پتہ بھی پڑھ لیا۔''(۷۵)

''دروازہ کھلتا ہے'' میں تصوف کے سبھی رنگ وجدانی جذبوں کی آواز بن کر لفظوں کی صورت ہمارے سامنے آن موجود ہوئے ہیں۔ اپنی اصل کی تلاش، اپنی حقیقت کا ادراک، اپنی روح کی حقیقت کا ادراک اور اپنی تلاش کے سفر میں درپیش مشکلات و مصائب تصوف کے یہ سب پہلو اس ناول میں نہایت خوب صورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔ ابدال بیلا نے نہایت خوب صورت انداز میں اس حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے کہ اپنے رب کی ذات سے محبت، اس کی رضا میں راضی رہنا، اپنی میں کو مار کر اپنا آپ اس ذات کے حوالے کرنا، اپنے نفس کو برے اخلاق سے پاک کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جنہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا کر کوئی بھی اس پاک ذات کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ ابدال بیلا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو اللہ سے محبت پر مجبور نہیں کرتا، وہ اخلاقی اقدار اپنانے کے لیے تبلیغ نہیں کرتا، وہ تصوف کی ادق اور گنجلک اصطلاحات استعمال نہیں کرتا بلکہ سادہ اور عام فہم انداز میں مختلف قصے کہانیوں کی صورت میں قاری کی فکری سطح کو متاثر کرتے ہوئے اس کے دل کی دنیا پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ قاری خود اپنے من میں یہ جذبہ پیدا کرے کہ اسے شہنشاہوں کے شہنشاہ کے طرف جانا ہے، اس کے حضور ماتھا ٹیکنا ہے، اس کا دروازہ کھٹکھٹانا ہے اور ناول پڑھتے ہوئے قاری کے قدم خود بخود اس کے دروازے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں وہ بغیر کسی زور زبردستی کے اپنی رضا اور خوشی کے ساتھ ابدال بیلا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ''تم'' تک پہنچنے کا سفر کرتا جاتا ہے اور بالآخر خود کو روشنی کے حصار میں سربسجود پاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔القرآن،احمد رضاخان،مترجم،سورہ الذاریات،آیت ۵۶،مکتبہ المدینہ،کراچی،۲۰۱۷ء،ص ۹۶۴

۲۔فیروزالدین،مولوی(مؤلف)،فیروزاللغات اردو جامع،فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور،۲۰۰۵ء،ص ۳۹۰

۳۔احمد دہلوی،سید،فرہنگِ آصفیہ،،ترقی اردو بیورو نئی دہلی،۱۹۸۷ء،ص ۶۱۷

۴۔انور جمال،پروفیسر،ادبی اصطلاحات،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۲۰۱۷ء،ص ۵۷

۵۔شبلی نعمانی،علامہ،الغزالی،معارف پریس،اعظم گڑھ،۱۹۵۶ء،ص ۱۶۵

۶۔شیخ قطب الدین دمشقی،امداد السلوک،رشید احمد گنگوہی(مرتب)،دارالکتاب دیوبند،یو۔پی،۲۰۰۵ء،ص ۱۵۶

۷۔عبدالکریم ہوازی قشیری،رسالہ قشیریہ،مترجمہ محمد وسیم اکرم القادری،مشتاق بک کارنر،لاہور،۲۰۱۲ء،ص ۱۴۱

۸۔علی بن عثمان ہجویری،سید،کشف المحجوب،مترجمہ فضل الدین گوہر،ضیاالرحمٰن بپلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۰ء،ص ۸۸

۹۔ابوالقاسم ابوالکریم ہوازن قشیری،تصوف کاانسائیکلوپیڈیا،مترجمہ محمد عبدالنصیر بن عبدالبصیر،مکتبہ رحمانیہ، لاہور،س،ص ۶۴

۱۰۔رضاحیدر،ڈاکٹر،اردو شاعری میں تصوف اور روحانی اقدار،غالب انسیٹیوٹ،نئی دہلی،۲۰۰۷ء،ص ۲۲۔۲۱

۱۱۔فیروزالدین،مولوی(مؤلف)،فیروزاللغات اردو جامع،ص ۹۱۸

۱۲۔محمد اسحاق جلالپوری،تاج محمد(مرتبین)درسی لغت اردو،مقتدرہ قومی زبان اردو،اسلام آباد،۲۰۱۲ء،ص ۹۱۴

۱۳۔ابوالاعجاز صدیقی،ادبی اصطلاحات کا تعارف،اُسلوب،لاہور،۲۰۱۵ء،ص ۳۲۱

۱۴۔القرآن،احمد رضاخان(مترجم)،،سورۃ الکھف،آیت ۱۱۰،ص ۵۶۹

۱۵۔ابدال بیلا،دروازہ کھلتاہے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶ء،ص ۱۷۹۹

۱۶۔مثنوی مولانا روم،جلال الدین رومی،مولانا،مترجمہ محمد عالم امیری،دارالعلوم جامعہ ایوبیہ،لاہور،۱۹۹۹ء،ص ۱

۱۷۔القرآن،احمد رضاخان(مترجم)،سورۃ البقرہ،آیت ۱۶۵،ص ۵۴

۱۸۔ابدال بیلا،دروازہ کھلتاہے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶ء،ص ۱۵

۱۹۔ واصف علی واصف، واصفیات، کاشف پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۹

۲۰۔ ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، ص۱۹

۲۱۔ ایضاً، ص۲۱

۲۲۔ ایضاً، ص۲۵

۲۳۔ ایضاً، ص۳۸۹۔۳۸۸

۲۴۔ ایضاً، ص۲۶۷

۲۵۔ ایضاً، ص۱۴۱۵۔۱۴۱۴

۲۶۔ ایضاً، ص۱۷۹۰

۲۷۔ ایضاً، ص۱۷۹۸

۲۸۔ ایضاً، ص۱۷۹۹

۲۹۔ ایضاً، ص۴۷

۳۰۔ ایضاً، ص۴۹

۳۱۔ ایضاً، ص۵۲

۳۲۔ ایضاً، ص۵۸

۳۳۔ ایضاً، ص۳۸۷۔۳۸۶

۳۴۔ ایضاً، ص۶۱۳

۳۵۔ ایضاً، ص۷۴۱

۳۶۔ ایضاً، ص۱۷۹۳

۳۷۔ القرآن، احمد رضا خان، مترجم، سورہ المائدہ، آیت ۴۰، ص۲۱۹

۳۸۔ ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، ص۲۸

۳۹۔، ایضاً، ص۱۷۵۔۱۷۴

۴۰۔ ایضاً، ص۳۷۹

۴۱۔ ایضاً، ص۵۸۷

۴۲۔ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۵۲۔۱۰۵۱

۴۳۔ایضاً، ص ۱۰۵۴

۴۴۔ایضاً، ص ۱۷۹۶۔۱۷۹۵

۴۵۔ایضاً، ص ۵۶۹

۴۶۔ایضاً، ص ۷۰۸

۴۷۔ایضاً، ص ۷۱۸

۴۸۔ایضاً، ص ۱۰۸۴

۴۹۔ایضاً، ص ۱۰۸۶

۵۰۔ایضاً، ص ۳۳

۵۱۔ایضاً، ص ۵۸

۵۲۔ایضاً، ص ۹۳۳۔۹۳۲

۵۳۔ایضاً، ص ۹۵۲

۵۴۔ایضاً، ص ۹۵۳

۵۵۔ایضاً، ص ۱۰۴۷

۵۶۔ایضاً، ص ۱۰۵۶۔۱۰۵۵

۵۷۔ایضاً، ص ۱۷۸۹

۵۸۔ایضاً، ص ۱۷۹۳۔۱۷۹۲

۵۹۔ایضاً، ص ۱۰۵۔۱۰۴

۶۰۔ایضاً، ص ۱۶۳

۶۱۔ایضاً، ص ۱۷۳

۶۲۔ایضاً، ص ۱۶۶

۶۳۔ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۱

۶۴۔ایضاً، ص ۱۴۳۶

۶۵۔ایضاً، ص ۱۷۹۷

۶۶۔ایضاً، ص ۴۵

۶۷۔ایضاً، ص ۴۷

۶۸۔ایضاً، ص ۴۴۔۴۳

۶۹۔ایضاً، ص ۱۴۴۔۱۴۳

۷۰۔ایضاً، ص ۱۴۵

۷۱۔ایضاً، ص ۵۶۷

۷۲۔ایضاً، ص ۶۶۹۔۶۶۸

۷۳۔ایضاً، ص ۷۰۴

۷۴۔ایضاً، ص ۷۱۴

۷۵۔ایضاً، ص ۱۷۸۳۔۱۷۸۲

باب سوم:

ناول ''دورازہ کھلتاہے'' میں اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر

اسطورہ کسی بھی قوم کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی روایات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسطورہ کی مدد سے ہم کسی بھی قوم کے اجتماعی شعور سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اساطیر کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے اور بعض اوقات ماضی کی بازیافت بہت سے واقعات کی شکل میں حال میں سامنے آتی ہے۔ جس سے ماضی کے آئینے میں حال کی تعبیر و تفہیم ممکن ہو پاتی ہے۔ اساطیر اور مافوق الفطرت عناصر مابعد الطبیعات کا جزو لاینفک ہیں اور ان ماورائی واقعات کی سائنسی اور عقلی تعبیر ناممکن ہے۔ یہ اساطیری واقعات نہ صرف انسان کو ورطہ حیرت میں ڈالتے ہیں بلکہ ان کی مدد سے ہم انسانی عزم و ہمت اور حوصلے کی لازوال داستانوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اپنے ناول ''دروازہ کھلتاہے'' میں ابدال بیلا نے اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر کی مدد سے قاری کا رشتہ اس کے ماضی کے ساتھ استوار کرنے اور انسانی زندگی کی ان گنت پُراسرار اور ماورائے عقل سطحوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ''دروازہ کھلتاہے'' میں موجود اساطیری عناصر کا جائزہ لینے سے پہلے ہم اساطیر کے لغوی اور اصطلاحی معنی نیز اس کے دائرہ کار کے حوالے سے مختصر وضاحت کریں گے۔

لغوی لحاظ سے دیکھا جائے تو اساطیر، اسطورہ کی جمع اور عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی قصے، کہانیاں ہیں۔ ہندی میں اساطیر کے مترادف کے طور پر دیومالا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے لیے ایک مروج اصطلاح علم الاصنام بھی ہے۔ جسے دیوتاؤں کا علم کہا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں اساطیر کے لیے Myth کا لفظ رائج ہے۔ جب کہ اس علم سے منسوب روایات کی کہانیوں کی مجموعی شکل کو Mythology کہتے ہیں۔ اساطیر کا وجود اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ بذاتِ خود انسان۔ جب انسان کی تخلیق عمل میں آئی اور وہ اس زمین کا حصہ بنا تو اسے نطق سے نوازا گیا۔ انسان نے اس نعمت سے فائدہ اُٹھایا اور بولنا سیکھا۔ یوں زبان کے ساتھ ہی قصے، کہانیوں کی ابتدا ہوئی اور اساطیر نے جنم لیا۔ اساطیر گہری معنویت کی حامل ہوتی ہیں۔ مختلف قوموں کی تہذیب، ثقافت، مذہب اور تاریخ سے آگاہی میں اساطیر کا کردار نمایاں ہے۔

انسان نے جب آنکھ کھولی اور ہوش و خرد کی دنیا میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اس نے اپنے ارد گرد چاند،

سورج، ستارے وغیرہ جیسے مظاہرِ قدرت کو نمایاں پایا۔ اپنی محدود عقل سے اس نے ان مظاہر فطرت کی تشریح و تعبیر کی کوشش کی۔ اس کے لاشعور نے مرعوبیت اختیار کی اور ان مظاہر قدرت کو دیوی، دیوتاؤں کے عہدے پر فائز کر دیا۔ انہیں ناقابل شکست اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک سمجھا۔ ان کی عبادت اور خوشنودی کے لیے مختلف رسوم ورواج کو اپنایا۔ رفتہ رفتہ یہ عقائد و نظریات کہانیوں کی صورت میں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو کر مستقل طور پر اساطیر کی شکل میں نمودار ہوئے اور اس تہذیب کا حصہ بن گئے۔ دنیا کی ہر قوم اور تہذیب اپنے جداگانہ فکری رویے اور مذہبی روایات کے باعث الگ الگ اساطیری ورثے کی مالک ہوتی ہے۔ کائنات کی تخلیق ہو یا آدم کی پیدائش، حیات بعد الموت ہو یا جنت جہنم کا ذکر، آواگون کا نظریہ ہو یا جزا اور سزا کے عقائد، جن، پریوں اور دیوؤں کا ذکر ہو یا انسان کی ہیت بدلنے کی داستان یہاں تک کہ سیلابِ عظیم وغیرہ ہر مذہب میں اس حوالے سے اپنی اپنی اساطیر موجود ہیں۔ ان اساطیر کی صداقت اور سچائی پر کوئی حرف نہیں اُٹھایا جا سکتا نیز یہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے کسی بھی شہادت کی محتاج نہیں ہیں۔ اسطوری قصے اور کہانیوں کے کردار طبعی دنیا سے ماورا اور مابعد الطبیعیاتی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ غیر معمولی اور محیر العقول کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ دیگر مخلوق کے مقابلے میں غیر معمولی صلاحیتوں اور کرشماتی طاقت کے حامل ہوتے ہیں۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر کوئی بھی ناممکن کام ممکن بنا سکتے ہیں اور ان کے دم سے کوئی بھی انہونی وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔

دیومالا، اساطیر یا علم الاصنام کے بارے میں علم وادب سے تعلق رکھنے والے مختلف ماہرین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں، اقوام اور مذہب سے تعلق نے اس کے معنی کو وسعت اور نئی جہتیں عطا کی ہیں۔ مختلف لغات، انسائیکلو پیڈیا اور کتب کے حوالے سے اساطیر کی تفہیم و تعبیر ذیل میں موجود ہے۔

فرہنگِ عامرہ میں درج ہے:

''اساطیر۔ اسطار واسطورہ کی جمع''(۱)

اردو لغت (تاریخی اُصولوں پر) کے مطابق

''اساطیری، اساطیر سے منسوب: خرافیاتی یا روایاتی''(۲)

علمی اردو لغت (جامع) کے مطابق

''دیومالائی۔ دیومالا سے منسوب، دیوتاؤں کے قصے، خیالی کہانیاں، علم الاصنام''(۳)

ڈاکٹر محمد اشرف کمال اپنی کتاب **''تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات''** میں متھ کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''متھ کا تعلق ایک ایسی کہانی یا قصے پر مبنی ہوتا ہے جو کہ دیوی، دیوتاؤں اور اساطیر کے ساتھ جڑا ہوا ہو۔ یہ کہانیاں قدیم عہد سے لے کر دورِ جدید تک سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔ ان کو اپنے اپنے مذہب اور تہذیب میں ایک تقدس اور اہم واقعے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ روایات پر مبنی وہ باتیں ہوتی ہیں جو اپنے ماننے والوں کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اساطیر کو جدید سائنس نے بچپنے کی باتیں کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی مگر جدید سماجیات، علمِ انسان اور نفسیات نے انہیں اہمیت دی ہے اور مختلف فنکاروں اور ادیبوں اور ان کے عہد کو سمجھنے میں انہیں مزید کارآمد قرار دیا جاتا ہے۔''(۴)

پروفیسر انور جمال کے خیال میں:

''دیوتاؤں سے منسوب قصوں کو دیومالا کہتے ہیں۔۔۔ قدیم انسان نے چاند، سورج، پہاڑ، آسمانی بجلی، ہوا، پانی، سیلاب، زلزلہ اور دیگر مظاہر سے اپنا جذباتی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان سب کے لیے ''دیوتا'' تشکیل دیے اور ان سے قصے کہانیاں منسوب کر لیں چنانچہ اقوامِ عالم میں ایک طرح کی دیومالائی کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ جنہیں سیاح ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے۔ مصر، یونان۔ ہندوستان کے دیومالا نے مذاہبِ اقوام کے علاوہ تلمیحات کی صورت میں ادبیاتِ عالم پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔''(۵)

ابوالاعجاز صدیقی متھ کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''متھ یا اسطور ریتوں، رسموں، مذہبی شعائر و اطوار، تکوین کائنات اور مختلف النوع مظاہرِ فطرت کو مفروضہ دیویوں، دیوتاؤں اور ماورائی طاقتوں کی مفروضہ سرگرمیوں کے حوالے سے موضوع بناتا ہے۔ متھ کے لغوی معنی لفظ کے ہیں۔''(۶)

قاضی عابد حسین اپنی کتاب **''اردو افسانے میں اساطیری علامات''** میں اساطیر کی تعریف کرتے ہوئے اس کی حدود و قیود کی وسعت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسطورہ یا اسطور (دیومالا) ایک ایسی مقدس کہانی ہوتی ہے۔ جو فوق البشر روحانی ہستیوں کے کائنات میں عمل دخل، رسوم و رواج، رہن سہن اور کائنات سے ان کے تعلق کو بیان کرتی ہے۔ یہ فوق البشر ہستیاں دیوی دیوتا اور انسان دونوں ہو سکتے ہیں۔''(۷)

''منتخب ادبی اصطلاحات'' میں متھ کی تعریف، تشریح اور دائرہ کار کے تعین کو ایک مشکل امر قرار دے کر اس کی ممکنہ حد بندی اور وضاحت کی کوشش کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

''متھ ایک مقدس کہانی بیان کرتی ہے۔ کوئی ایسا وقوعہ جو قدیم یا اوائلی زمانے میں ہوا، وہ حکایاتی زمانہ جب سب کچھ شروع ہوا۔ تخلیقِ کائنات، دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں جو مختلف تہذیبوں میں نسل بہ نسل سینہ بہ سینہ روایت کے ذریعے سفر کرتی رہیں اور ان تہذیبوں میں انہیں مقدس یا مذہبی حیثیت دی گئی۔ یونانی اور ہندی اساطیر تو موجود ہیں لیکن اساطیر کا دائرہ چھوٹے بڑے ہر انسانی گروہ میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ یہ اساطیر بتاتی ہیں کہ کس طرح ما فوق الفطرت ہستیوں کے افعال کی وجہ سے کائنات یا حقیقت کا ظہور ہوا، چیزیں کیسے وجود میں آئیں یا ممکن ہوئیں۔ یہ اساطیر اپنے ماننے والوں کے لیے ہر سوال کا جواب ہیں۔ اساطیر کا کوئی ایک مصنف نہیں۔ شروع کہیں سے بھی ہوں یہ روایت کے طور پر موجود رہی ہیں۔ جب اساطیر سنائی جاتی ہیں تو سننے والے دراصل غیب کی طرف سے آنے والا ایک پیغام سنتے ہیں۔ چنانچہ اعتقاد رکھنے والوں کے لیے کائنات کے بارے میں سوالوں کے جواب بھی فراہم کرتی ہیں اور روز مرہ زندگی گزارنے کے لیے اقدار کا ایک نظام تشکیل دیتی ہیں، ان کی سماجی زندگی کو ممکن اور بامعنی بناتی ہیں۔ ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں اساطیری علامات اور تمثالوں ہی سے وقت اور معنویت حاصل کرتے ہیں۔ جدید دور میں اساطیر کو خلافِ عقل قرار دے کر رد بھی کیا جاتا رہا اور انھیں انسان کے عالمِ طفلی کا ایک مظہر قرار دے کر پرے ڈالنے کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن اسی دور میں انتھروپولوجی، نفسیات اور سماجیات کے عالموں نے ان کی معنویت کی گہرائیاں کھنگالیں۔ اساطیر کی تشریح کے مختلف مکاتب سامنے آئے۔

جیمز فریزر سے لیوی اسٹراس، یونگ سے جوزف کیمبل اور مرسیا ایلیا اور بعد کے علما تک
اساطیر شناسی کا بہت وسیع دائرہ موجود ہے۔"(۸)

دی گئی مختلف تعریفوں اور مختلف ناقدین کی آرا کی روشنی میں ہم یہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں کہ اساطیر کی بنیاد انسان کے حسی تجربے پر ہے۔ یہ خیالی قصے اور کہانیاں ہیں، خرافات ہیں، زبانی روایات ہیں جو آہستہ آہستہ معاشرے کا لازمی جزو بن جاتی ہیں۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل افراد سے سرزد ہونے والے واقعات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ کسی خاص قوم کے قدیم روایتی قصے ہیں، دیوی اور دیوتاؤں کے پُراسرار حالات زندگی کا بیان ہیں، تکوینِ کائنات کے متعلق مفروضات ہیں، مذہبی شعائر اور عقائد ہیں، ماورائی طاقتوں کی سرگرمیاں ہیں، فوق البشر روحانی ہستیوں کے کائنات میں عمل دخل کا بیان ہیں، داخلی کیفیات اور نفسیاتی کش مکش کا مطالعہ ہیں، ماضی اور تہذیب و تمدن کو سمجھنے کا وسیلہ ہیں، انسانی تخیل کی پیداوار اور انسانی وہم پر مبنی کہانیاں وغیرہ ہیں۔

ناول "دروازہ کھلتا ہے" میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کی ذیل میں اساطیری اور مافوق الفطرت عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تحیر اور خوف کی فضا، پُراسرار روحانی کیفیات و مشاہدات، جادو ٹونے اور فوق الفطرت عناصر کی مدد سے ابدال بیلا نے ایک اساطیری جہان کی منظر کشی کی کوشش کی ہے۔ اس پسِ منظر میں ایسے آباد جہان کو دیکھا جا سکتا ہے جو کئی طرح کی اساطیری جہتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ابدال بیلا کے ہاں ہندی اور اسلامی اساطیر نمایاں ہیں۔ اسلامی اساطیر ان روایات پر مشتمل ہے جو آسمانی کتب اور صحائف، انسانی اوہام، صوفیا کی زندگی کے ماورائی پہلوؤں، عقائد، لوک روایات، انسانی رسوم و رواج وغیرہ کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ جب کہ ہندی اساطیر ان روایات پر مشتمل ہے جو ان کی مذہبی کتابوں، ویدانت ادب مثلاً رامائن، مہابھارت وغیرہ میں موجود واقعات، عقائد، نظریات، رسوم و رواج وغیرہ کے نتیجے میں جنم لیتی ہیں۔ ابدال بیلا ناول "دروازہ کھلتا ہے" میں مختلف کرداروں، علائم، ماورائی اور پُر تحیر واقعات وغیرہ کی مدد سے ایک غیر طبعی ماحول کو پیش کرتے ہیں۔ ناول میں موجود اساطیری عناصر میں سے اساطیری کرداروں اور علائم کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔

الف۔ اساطیری کردار

اساطیری کہانیاں اور واقعات ایسے کرداروں سے بھرے پڑے ہیں جو حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مثلاً کالی داس کی شکنتلا وغیرہ۔ ابدال بیلا نے بھی "دروازہ کھلتا ہے" میں اپنے فن اور تخیل کے زور سے بے مثل و بے نظیر حسن کے مالک کردار متعارف کروائے ہیں جن کا حسن اساطیری کرداروں کے حسن و جمال

کی یاد دلا دیتا ہے۔ناول کا کردار ''صاحباں'' ایسے ہی اساطیری حسن کی مالک ہے جو صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے اور جس کی مالک قدیم اساطیری واقعات اور کہانیوں میں دیویاں اور شہزادیاں ہوتی تھیں۔ابدال بیلا، صاحباں کی خوبصورتی اور دلکشی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

''ایسا منہ زور حسن تھا اس کا کہ سر چڑھ کے اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔یہ کماد سے اونچا قد، لمبی چکنی گردن، صندل ملے دودھ جیسی رنگت، تیکھے کٹار جیسے نقش، کہانیاں کہتی، بجھارتیں بجھاتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ایسی روشن کہ انہیں آدھی رات کو دیکھ کے لگے کہ صبح ہونے لگی ہو۔اوپر کمان سی بھونیں جو سپولیوں کی طرح اس کے ماتھے پر سرسراتیں اور اس کی کہی ان کہی نگاہوں کے نئے نئے مفہوم جگاتیں۔ایک نظر وہ کسی کو دیکھ لیتیں تو ہیر سیال سے مرزا صاحباں تک کی ساری داستانیں کہہ ڈالتیں۔۔۔اس کے پیروں میں رقص کی ساری مرتیاں اور سو مرتیاں سجی تھیں۔۔۔لمبے بالوں کا پراندہ کدی کالے ناگ کی طرح پھن اُٹھائے بانسری کی تان پہ ناچتا رہتا۔''(۹)

صاحباں کے ہوشربا حسن، اس کی چال ڈھال کا دلکش پیرائے میں ذکر کرنے کے بعد ابدال بیلا مختلف تشبیہات کا سہارا لیتے ہوئے اس کے بگھی میں بیٹھنے کے منظر سے لوگوں کو مبہوت کر دیتے ہیں۔صاحباں کو جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔اس کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے۔

''بگھی میں یہ اکیلی یوں گردن اٹھائے بے نیازی سے بیٹھی ہوتی جیسے دیودار کی جلتی ہوئی لکڑی کا کوئی شعلہ ہو جو عین شاہ بلوط کے جنگل بیچ جل رہا ہو اور پورا جنگل اس سے سہما ہوا ہو۔جہاں بھی وہ ہوتی، ہر منظر سے الگ منفرد اور نمایاں۔جیسے ستاروں بھرے آسمان پر پورن ماشی کا چاند یا بیچ سمندر میں تیرتی کسی کشتی کا مستول۔جدھر سے یہ اپنی بگھی اور تانگوں سے گزرتی سارا شہر جوار بھاٹے میں اُبلتا ہوا سمندر بن جاتا۔۔۔رکے قدم چلنے لگتے، چلتے رک جاتے۔''(۱۰)

اسی طرح ناول کے ایک نسوانی کردار چانن کور کا حسن اساطیری حسن و جمال کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔چانن کور ایک مہاراجہ کے دیوان کی بیٹی تھی۔وہ کسی اپسرا کی مانند دکھائی دیتی۔اس کا حسن دیکھنے والوں پر سحر طاری کر دیتا۔ابدال بیلا نے لفظوں کے خوب صورت استعمال سے چانن کور کا جیتا جاگتا پیکر قاری کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

''چانن کور صرف نام ہی کی چانن کور نہ تھی۔ روشنی اس کے وجود کے اندر سے لشکارے مارتی تھی۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں نظر آتی تو لگتا، اندر کسی نے لالٹین جلا کے رکھ چھوڑی ہے صبح ہونے سے پہلے سرمئی اجالے میں اسے دیکھنا بڑا جوکھوں کا کام تھا۔ ایک طرف دھوپ میں اس کا اجلا چہرہ اور گوری بانہیں لش لش کرتی، سورج کے نیچے دھوپ بانٹتی پھرتیں اور دوسری طرف اس کی لمبی پلکیں، غزال آنکھوں پہ چھتری تانے اس کی نگاہ کے رُخ میں سرسراتی، دیکھنے والوں کو سائبان کا پتا بتاتیں۔ پتلی لمبی مورتی جیسی لڑکی تھی وہ۔ جیسے مکھن بھری لسی کی بلٹوئی سے شیشے کا گلاس بھر کے نکالا ہو، اجلی ملائم اور چکنی۔''(۱۱)

ابدال بیلا نے مختلف علائم کی مدد سے ناول میں اساطیری رنگ جمانے کی کوشش کی ہے۔ فرعون کو اساطیر میں خاص مقام حاصل ہے۔ مصر کے بادشاہوں کو فرعون کہا جاتا تھا۔ فرعون کے تذکرے سے قاری کا تخیل صدیوں پرانے فراعینِ مصر کے عہدِ حکومت کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔ ابوالفضل کے باپ کی کشتی کے پیندے میں کوئی سوراخ کر دیتا ہے۔ اس موقع پر فرعون کے ذکر سے ابدال بیلا اپنے عہد کا تعلق ماضی کے ساتھ جوڑتے ہوئے اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ایسا تو ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے کہ لوگ دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ راز بعد میں کھلتا ہے کہ آیا اس نقصان میں کیا نفع پوشیدہ تھا اور رب کی کیا مصلحت تھی۔

''پیندے میں سوراخ تو ہر فرعون عہد میں ہوتے آئے ہیں۔ سوراخ ہوتے سمے یہ تھوڑی پتہ ہوتا ہے کہ اس میں خیر ہے یا شر۔ یہ بھید تو بعد میں کھلتے ہیں۔''(۱۲)

سلیمانی ٹوپی قصے کہانیوں میں ایک اساطیری اور سحر انگیز وجود کی مالک ہے۔ جسے پہننے والا سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ مصنف نے اس قاری کی توجہ اس امر کی طرف دلائی ہے کہ جیسے سلیمانی ٹوپی پہننے والا کسی کو دکھائی نہیں دیتا اسی طرح مرنے کے بعد لوگ ہم سے دور نہیں جاتے، ہمارے آس پاس ہوتے ہیں بس ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔

''یہ نہ کبھی سوچ لینا کہ جانے والے واقعی چلے جاتے ہیں۔ بس وہ نظر نہیں آتے۔ ہوتے ادھر ہی یہیں کہیں ہیں۔ ان کے سروں پر سلیمانی ٹوپی پہنا دی جاتی ہے۔''(۱۳)

شیطان کا کردار شر اور بدی کی علامت ہے۔ مصنف اس کے ذکر سے قاری کی توجہ حج کے موقع پر شیطان کو کنکر مارنے کے تناظر میں موجود حقیقت کی طرف دلا کر ماضی اور حال میں تعلق پیدا کر کے اس واقعے کی اساطیری جہت کو سامنے لائے ہیں۔ ایرانی صحرائی ابو الفضل کو پکڑ لیتے ہیں۔ ان میں ایک جب ابو الفضل کو قتل کرنے لگتا ہے تو اس کی کیفیت ابدال بیلا ان الفاظ میں ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں۔

''وہ بندوق کے بٹ پر بولٹ مار کے گولی کو نالی میں گھسیڑ کے ایسے تن کے کھڑا ہو گیا،
جیسے شیطان کے بڑے بت پہ ایک ساتھ سات پتھر مارنے لگا ہو۔''(۱۴)

اساطیر کا مذہب سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کرشن مہاراج اور وشنو ہندوؤں کے دیوتا ہیں۔ کرشن مہاراج کا ذکر مہابھارت میں ملتا ہے جب کہ وشنو دیوتا کا تذکرہ ویدوں اور اپنشدوں میں بار بار آیا ہے۔ یہ دیوتا رحمت و شفقت کے پیکر سمجھے جاتے ہیں۔ ان دیومالائی کرداروں کے ذکر سے ابدال بیلا نے قاری کو ہندی اساطیر کے کرداروں سے متعارف کروایا ہے۔ لالہ جی ایک ہندو ہیں۔ ابو الفضل کو ان کے گم شدہ زیورات ملتے ہیں۔ جو وہ لالہ جی کو واپس کر دیتا ہے۔ اس موقع پر لالہ جی فرطِ مسرت سے اسے اپنے دیوتاؤں وشنو اور کرشن مہارج کے مصداق قرار دیتے ہیں۔

''آہ کا دھرم اگر اس سے میلا نہیں ہوتا تو مجھے تو اپنے دھرم کا پالن کرنے دیں۔ آپ
رام جی جیسا وشنو کا اوتار ہیں میاں جی، کرشن مہاراج کا روپ ہیں۔''(۱۵)

اساطیری علائم اساطیری جہتوں کو سامنے لاتے ہیں اور ماضی کی دریافت عمل میں آتی ہے۔ قدیم ہندی اساطیر میں سورج کو دیوتا کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندی میں اسے سوریا کہتے ہیں۔ سورج راجپوتوں کا دیوتا ہے۔ اسے کائنات کا خالق مانا جاتا ہے۔ ابو الفضل کے ہاں بیٹا پیدا ہونے پر اس کی بیوی کے دل میں بیٹے کے بارے میں اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ

''بچے کو دیکھ کے ماں کو شک ہو گیا تھا کہ اس کی کوکھ سے سورج پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ہندو
عورتوں سے سورج دیوتا کی اسی قسم کی نشانیاں سنا کرتی تھیں۔''(۱۶)

رستم ایک اساطیری کردار، فوق البشر سورما اور افسانوی کردار ہے، جو طاقت کی علامت ہے۔ اس کا تعلق ایران سے تھا۔ اس نے مختلف مہمات میں دیوؤں کو بھی شکست دی اور فوق الفطرت کارہائے نمایاں انجام دیے۔

ابوالفضل گاؤں کی عورتوں کو سیستان کے سفر کے حوالے سے قصے سناتے ہوئے رستم کے ہیبت ناک قلعے کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کنویں کا بتاتا ہے جس کا وزنی ڈھکن رستم اکیلا اُٹھالیا کرتا تھا۔

''لو سوچو ، وہ بارہ ہاتھ چوڑا کھوہ تھا۔اس کے ڈھکنے کا پتھر کوئی بیسیوں من کا ہو گا۔ہمارے پچیس آدمیوں نے مل کر اسے پوری طاقت لگا کے ایک ہاتھ سرکایا تھا۔اٹھا نہیں تھا وہ پھر بھی۔ مگر کہتے ہیں، اسی ہینڈل سے پکڑ کر رستم اکیلا اس ڈھکن کو اُٹھا تا رکھتا تھا۔''(۱۷)

ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کے دور میں ملک یمن پر حکومت کرتی تھی۔اس کی قوم سورج کی پوجا کرتی تھی۔بعد ازاں اپنی قوم سمیت حضرت سلیمانؑ پر ایمان لے آئی۔ناول کا کردار ''میں''، ''تم'' سے مخاطب ہو کر اس کے سامنے اپنا حالِ دل بیان کرتا ہے اور دونوں کے درمیان دوری پر اسے ملکہ سبا قرار دے کر اپنی بے بسی کا ذکر کرتا ہے۔

''کیوں تو ملکہ سبا بنی بیٹھی ہے۔جب مجھ میں سلیمان کی سلطانی نہیں۔میرے پاس کون سے لوح و قلم کی راجدھانی میں رکھے صحیفوں سے آشنا وہ مردِ قلندر لوگ کھڑے ہیں جو دو پلکوں کی جنبش سے پہلے تمہیں تمہارے تخت کے چاروں پاؤں سمیت آنکھ کی نظر سے بھی تیز رفتاری سے اُٹھا کے مجھ تک پہنچا دیں۔''(۱۸)

آواگون کو ہندی اساطیری عناصر میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ہندی مذہبی روایات کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح کسی اور قالب میں داخل ہو جاتی ہے۔ابدال بیلا نے اس کی مدد سے مابعد الطبیعیاتی کیفیت پیدا کی ہے۔

''رانی خود کو مہارانی سمجھنے لگی۔ بچپن سے اسے شبہ تھا کہ وہ صرف محلوں اور حویلیوں میں راج کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔اپنے باپ کی بھی وہ اکیلی بیٹی تھی۔لاڈلی تھی۔اسی نے اس کے کان میں کہا تھا۔تو پچھلے جنم میں ہفت اقلیم کی شہزادی تھی۔اس نے اس جنم میں بھی راج پاٹھ سنبھال لیا۔''(۱۹)

اسی طرح ناول کے باب ''ہم'' میں جب ''میں'' بابا کے سامنے بیٹھا ہوتا تو اسے بابا کی نظریں اپنے جسم کو تولتی ہوئی محسوس ہوتیں، وہ ان کی نظروں کی کشش کی تاب نہ لا سکتا:

''ایسے ہر منظر میں میرے بدن پہ عجیب چیونٹے سے چلنے لگتے۔ میں آواگون پہ یقین نہیں رکھتا، نہ وہ رکھتے تھے مگر اس لمحے مجھے لگتا جیسے وہ میرے وجود کو اپنے دوسرے جنم کے لیے چنے بیٹھے ہیں۔ اس لمحے مجھے سر سے پیر تک پسینہ آجاتا۔ میں لرز جاتا۔''(۲۰)

ابدال بیلا اپنی تخیلاتی اُڑان کی مدد سے اساطیری رنگوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ دوسرے جنم کا ذکر اور زمان و مکان کی قید سے ماورائیت ناول میں مابعد الطبیعیاتی کیفیت پیدا کرتی نظر آتی ہے۔ جرمنی میں قیام کے دوران ''میں'' کو محسوس ہوتا ہے جیسے ''تم'' سیر اں ثانی ہے۔ سیر اں، ابو الفضل کو طبعی رکاوٹوں کے باوجود روح کی آنکھ سے دیکھ لیتی تھی۔ اسی طرح ''میں'' کو بھی لگتا ہے کہ شاید ''تم'' اسے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے سے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

''اس لمحے بھی تم ڈیڑھ ہزار میل دور مجھ پہ نظریں گاڑے دیکھ رہی ہو اور مسکرا رہی ہو۔ سنو۔ تم سیر اں تو نہیں ہو؟ سیر اں ثانی۔ میں دوسرے جنم پہ یقین تو نہیں رکھتا۔ مگر کیا پتہ کوئی استثنا ہو۔''(۲۱)

اسی طرح ابدال بیلا ناول میں ایک اور جگہ آواگون کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ جنم گزری ہوئی جگہوں کا ہے۔ ہردت سنگھ کو موت کی سزا ہو جاتی ہے۔ ابو الفضل اسے آخری دفعہ اس کے گھر والوں سے ملوانے لاتا ہے۔ گاؤں کی چکی کی کُو کُو کی آواز سے ہردت سنگھ کو وقت دوبارہ سے جنم لیتا نظر آتا ہے۔

''وقت کی گاڑی کے پہیے پیچھے سرکنے لگتے ہیں۔ گزرے مقام پھر سے نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب گزرا ہوا زمانہ ہی نہیں گزری ہوئی جگہیں بھی دوسرا جنم لے لیتی ہیں۔ ہردت سنگھ کا وقت اور جگہ کے دوسرے جنم پر تو ایمان نہیں تھا، مگر اپنے دوسرے جنم کو وہ مانتا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس جنم کی اس کی زندگی میں صرف گنتی کے کچھ دن رہ گئے تھے۔''(۲۲)

مہاتما بدھ کی راجدھانی کا نام کپل وستو تھا۔ جو اس نے نروان حاصل کرنے کے لیے تیاگ دی تھی۔ ماضی میں بدھا نے ابدی سکون کے لیے سب کچھ داؤ پہ لگا دیا اور آج کے دور میں بھی انسان ازلی ابدی سکون کا متلاشی ہے اور اس کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہے۔ ''میں''، ''تم'' سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

''میں نے کپل وستو کی اپنی ساری راجدھانی تیاگ دی اور ننگے سر، ننگے پاؤں تیری خوشبو

کی راہ پہ چلتے چلتے تیری ٹھنڈی چھاؤں ڈھونڈلی اور جب تم نے مجھے اپنی چھاؤں میں بیٹھنے کی اجازت دے دی تو میں پھر کبھی نہیں اُٹھا۔ دیکھ لو، وہیں بیٹھا ہوں۔ تیری چھاؤں میں بیٹھا بیٹھا تو میں تیرے وجود کا ہی حصہ ہو گیا ہوں۔''(۲۳)

اساطیری عناصر کہانی میں موجود تہذیبی اور ثقافتی عناصر سامنے لانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔لال خان جو ارجمند بانو کا باپ ہے۔دہلی شہر سے عشق کرتا ہے۔دہلی کو ماں اور خود کو اس کا بیٹا سمجھتا ہے۔لال قلعہ اس کی محبت کا مرکز ہے۔اب جب کہ دہلی کا عروج زوال پذیر ہے تو مصنف آواگون کی اساطیر کی مدد سے قاری کو ماضی کا سفر کراتا ہے۔

''میں آواگون پر یقین نہیں رکھتا، لیکن مجھے لگتا ہے پچھلے جنم میں، میں لال قلعہ تھا۔آباد لال قلعہ، اطلس و کم خواب کی سر سراہٹوں میں گلاب و عنبر سے مہکتا ہوا لال قلعہ۔جب میرے وجود میں ابھرتے سورج کی کرنیں یاقوت و پکھراج کی کنیوں میں کرنوں کی بارات بن کر طلوع ہوتی تھیں۔سونے کے طشت میں پڑی سچے موتیوں کی لڑیوں میں دن کی ساعتیں پروتی تھیں اور شام ڈھلتے سمے نیلم و زمرد کی جگمگاتی سانسوں سے چاندنی کشید کرتی تھیں۔چاندنی ان دنوں ادھر پورن ماشی کی محتاج نہیں ہوا کرتی تھی۔اندھیری راتوں میں بھی وہ میرے وجود کے اندر ٹھہری رہتی تھی۔میرے دیوانِ خاص میں توہیروں کی چکا چوند سے چاندنی بھی شرما جاتی تھی۔ تمھیں کیا بتاؤں میں کیا تھا اور تیرے اندر کیا نہیں تھا۔''(۲۴)

ارجمند بانو کے پوچھنے پر کہ میں پچھلے جنم میں کیا تھی، لال خان اسے بتاتا ہے کہ تم دہلی کی جامع مسجد ہو تم ہمیشہ آباد رہو گی۔لال خان کو دہلی کے اُجڑنے کا غم ہے۔اساطیری لوک کہانیوں میں دہلی شہر کی آبادکاری کے متعلق بھی ایک دیومالائی کہانی موجود ہے۔ جس کا ایک اہم کردار شیش ناگ ہے۔ شیش ناگ کو ہندو مذہب میں مقدس تصور کیا جاتا ہے۔دہلی شہر کب آباد ہوا، اس کے بارے میں لال خان بتاتا ہے کہ

''مہابھارت کے دور میں، تین ہزار سال پہلے۔ادھر پرانے قلعے کے پاس اندرپرست نام کا شہر تھا۔وہ پہلی دہلی تھی۔اشوک کے پاٹلی پترہ سے بھی ایک ہزار پہلے کی بات کر رہا ہوں۔بہتیرے راجے مہاراجے ادھر گزرے۔اننگ پال ادھر لوہے کی لاٹھ لے کر آیا۔جوتشیوں نے جگہ کا تعین کیا۔لاٹھ زمین میں گاڑھ دی۔ پھر اسے شک ہوا کہیں غلط

نہ گاڑھ دی ہو۔جوتشیوں سے دریافت کیا جگہ صحیح کہی یا غلط۔وہ بولے صحیح ہے۔نیچے زمین کے اندر، عین اسی جگہ پہ اس وقت سانپوں کے بادشاہ شیش ناگ کا سر تھا۔جو اس سمے لوہے کی لاٹھ سے کچلا گیا ہے۔اننگ پال کو شک ہوا کہیں مہنت کہانی نہ سنا رہے ہوں حکم دیا لاٹھ کھینچو اس کا نچلا کونا مجھے دکھاؤ۔لاٹھ باہر نکلی تو دیکھا،اس کا نچلے کونے پہ تازہ خون لگا ہوا تھا۔"(۲۵)

شری کرشن مہاراج ہندوؤں کے دیوتا ہیں۔جن سے پیدائش کے وقت سے ہی مافوق الفطرت باتیں منسوب ہیں۔"دروازہ کھلتا ہے"میں ابدال بیلا نے کرشن مہاراج کے ذکر کے ساتھ اس حقیقیت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ کیسے مذہب کے ٹھیکدار معصوم لوگوں کو دیوتاؤں کے نام پہ بے وقوف بنا کے ان سے روپے پیسے بٹورتے ہیں۔گنگا کنارے لگنے والے میلے میں لوگوں کو کرشن مہاراج کی نقلی مورتی کے درشن کے کرا کر بیوقوف بنایا جاتا ہے اور پیسے بٹورے جاتے ہیں۔

"پھر کئی مہا مہنت گیروے کپڑوں میں ملبوس ٹیکے، قشقے لگے ہوئے، ماتھے دھاری، جٹیں کھولے آکر بیٹھ گئے درمیان میں۔ بھجن کی لے بڑھ گئی، سُر تیز ہو گئے۔وہ کوئی ایسا بھجن گانے لگے جس میں شری کرشن مہاراج جی کے ورود کا ذکر تھا۔ان کے آنے کی خوش خبری تھی، لوگوں کے دل جوش عقیدت سے ابلنے لگے۔وہ بیٹھے بیٹھے پنجوں کے بل ہو گئے۔ گردنیں اوپر ہو گئیں۔آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں، پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔سامنے پڑے پھولوں کے ڈھیر پہ ایکا ایکی میں ایک ہلکی سی ہلچل ہوئی، کچھ پھول ہلے، ادھر اُدھر ہٹے اور پھولوں کے ڈھیر کے عین بیچ سے ایک ساعت کے لیے شری کرشن مہاراج کی شبیہ ابھری۔ معصوم سانولا کرشن، ہاتھ میں بانسری، سارے ماحول پہ وجد طاری ہو گیا۔"(۲۶)

اسلامی تاریخ میں پیغمبر، اہلِ بیت، صحابہ کرام، اولیااللہ، مقدس مقامات اور آسمانی صحائف کے قصے اور کہانیاں مل کر اساطیری صورتِ حال کی تخلیق کا باعث بن رہی ہیں۔یہ اساطیر مافوق الفطرت حقائق کی تعبیر ہیں۔حضرت موسیٰ آگ لینے گئے پیغمبری لے آئے۔ نیز آپ جب فرعون کے جادوگروں کے مقابل آئے تو آپ کا عصا بڑے سانپ میں تبدیل ہو گیا۔ابدال بیلا نے ایک مانوس فضا میں اسلامی اسطور سازی کی منظر کشی کی ہے۔

''دیکھو آگ لانے کی تمنا ہر انسان میں رہی ہے۔ یہ تمنا کبھی کبھی انسان کو خدا کے روبرو لا کھڑا کرتی ہے۔ بھول گئی، حضرت موسیٰؑ کو۔ آگ لینے گئے تھے کہ اس سے ہاتھ تاپیں۔ آگے ایک جھاڑی میں آگ جلتی نظر آرہی تھی۔ مگر وہاں سے بھی آگ نہ ملی پیغمبری مل گئی۔ صدر جس دور میں جنگل میں رہ رہا تھا۔ وہ ختم الرسول ﷺ کا دور تھا۔ نہ کسی جھاڑی سے آگ جلی نظر آئی نہ کوئی آواز اس نے سنی کہ جوتے اتار دو۔ پھر جوتے اس نے کون سے پہنے ہوئے تھے۔ ہاں ڈنڈا تھا وہ بھی سانپ نہ بنا۔''(۲۷)

گوتم بدھ بھی ایک ایسا اساطیری کردار ہے جس کے اعمال وافعال طبیعی دنیا کے لوگوں سے مختلف اور غیر فطری ہیں۔ صدر کا دوست حمید جب قیدی کیمپ سے بھاگتا ہے تو بھکشوؤں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ بعد میں جب اس کی ملاقات صدر سے ہوتی ہے تو وہ اسے بدھا کے بارے میں بتاتا ہے۔

''انتیس برس کی عمر میں بدھا جی اپنے محل سے ننگے پاؤں نکل گیا۔ جنگل جنگل بستی بستی۔ پتہ نہیں بدھا کہاں پھرتا رہا۔ آخر برسوں کی تپسیا رنگ لائی، کوئی پینتیس چالیس کا سن ہوگا کہ ایک پیپل کے پیڑ نیچے گیان ودھیان میں ڈوبے بیٹھے کو آسمان سے روشنی مل گئی۔ نروان حاصل ہو گیا۔ اس کا اندر باہر روشن ہو گیا۔ وہ روشنی سے بھر گیا۔ جانتے ہو۔ بدھ روشنی پانے والے کو کہا جاتا ہے، اسی دن سے وہ بدھا بن گیا اور وہ درخت بدھی ورش کہلانے لگا۔''(۲۸)

روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں حلول کر جانا قدیم اساطیر کا حصہ ہے۔ ''تبت میں زندہ بدھا کو مانتے ہیں۔ کہتے ہیں اس میں بدھا کی روح حلول کر جاتی ہے اسے لاما کہتے ہیں۔''(۲۹) اسی طرح مہابھارت کا تذکرہ بھی ''دروازہ کھلتا ہے'' میں موجود ہے۔ یہ ایک لاکھ اشعار پر مشتمل پرانے وقتوں کی ایک دیومالائی کہانی ہے۔ اس میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان لڑی گئی جنگ کا ذکر ہے۔ یہ جنگ چچیرے بھائیوں کے درمیان لڑی گئی۔ پانڈو کے پانچ بیٹے تھے۔ جب کہ دھرت راشٹر کے سو بیٹے تھے۔ پانڈو کے بیٹے بارہ سال کا بن باس کاٹ کے واپس آئے تو کوروؤں سے لڑائی ہوئی۔

''ایک ایک دن گنتے بارہ سال پورے کیے۔ واپس آئے تو کوروں نے پھر جوئے کی بساط بچھالی۔ یہ بھی بیٹھ گئے کھیلنے جوا۔ پھر ہار گئے۔ محل کی ساری اشیا ایک ایک کر کے ہار دیں۔ پھر حکومت اور ریاست بھی داؤ پر لگادی۔ وہ بھی ہار گئے۔ آخر میں پانچوں بھائیوں

کے پاس ایک مشترکہ بیوی رہ گئی، دروپدی۔اسے داؤ پہ لگا دیا۔وہ بھی ہار گئے تب لڑائی کی نوبت آئی۔ماموں شری کرشن مہاراج خود ایک راجا تھے۔فوج ان کی کوروؤں سے جا ملی۔خود وہ پانڈوؤں کے ساتھ تھے۔''(۳۰)

رام، سیتا اور مہاراکشش راون ہندی اساطیری کردار ہیں۔اس کی کہانی ''رامائین'' کی صورت میں سامنے آتی ہے۔رام جی نے بھی چودہ سال کا بن باس کاٹا۔جب اپنی بیوی سیتا کے ساتھ شہر پہنچے تو لوگوں نے دیے روشن کیے، چراغاں کیا۔اسی دن سے دیوالی کی ابتدا ہوئی۔دیوالی سے چودہ دن پہلے دسہرہ بھی ہوتا ہے۔اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

''اس دن رام جی نے مہاراکشش راون کو لنکا میں مار کے اپنی بیوی سیتا رانی اس سے چھڑائی تھی۔وہ کیسے ادھر پہنچ گئی؟ راون اٹھا کے لے گیا تھا۔سال سے زیادہ عرصہ اپنے پاس رکھی۔''(۳۱)

ابدال بیلا نے اساطیری کرداروں اور علائم کی مدد سے حال کا رشتہ ماضی کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ قاری حال میں رہتے ہوئے خود کو ایک اساطیری جہان کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ لیکن اساطیری جہان کا حصہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قاری ان تمام اساطیر سے مانوس ہو جس کا ذکر ناول میں کیا گیا ہے۔ تناسخ، آواگون، کرشن مہاراج، سوج دیوتا، وشنو دیوتا، مہابھارت، رامائن، گوتم بدھ، رستم، رام، سیتا، راون، شیطان، ملکہ سبا، حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے تذکرے سے ابدال بیلا نے قاری کو اساطیری رنگوں کے ایک جہان سے روشناس کروایا ہے۔ نیز لال قلعہ، دہلی کی جامع مسجد اور دہلی کی آبادکاری کی اساطیر کی مدد سے قاری کو ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے سے روشناس کروانے کی کوشش کی ہے۔

ب۔پُراسراریت:

اساطیر عموماً معصوم، پُراسرار اور حیرت انگیز انسانی تجربات پر مشتمل قصے، کہانیاں اور واقعات ہوتے ہیں۔ادب میں اسطوری فضا کئی طرح سے پیدا کی جاسکتی ہے مثلاً خوابوں کی مدد سے ماحول میں پُراسراریت کا رنگ شامل کیا جاتا ہے۔یوں کہانی کے داخل سے مابعد الطبیعیاتی جہت پھوٹتی نظر آتی ہے۔ابدال بیلا نے بھی خوابوں کی مدد سے اپنے ناول میں مابعد الطبیعیاتی اور اساطیری جہت پیدا کی ہے۔ابوالفضل کا باپ مرنے سے پہلے ایک کبوتر کی شکل میں اپنے بیٹے کی خواب میں ظاہر ہو کر اس سے آخری ملاقات کرتا ہے۔

''ایک رات کیا ہوا۔خواب آیا۔دیکھا۔اس کے خیمے کے بانس کی نکر پہ ایک کبوتر بیٹھا ہے۔کبوتر کی آنکھوں میں اس کے باپ کی نگاہ ہے۔پھر کبوتر بولتا ہے اور اسے اپنے باپ کی آواز آتی ہے۔کبوتر کہتا ہے بیٹا تم آئے ہی نہیں ۔انتظار کرتا کرتا میں اب جا رہا ہوں۔جاتے جاتے سوچا تمہیں دیکھ لوں۔اچھا۔کبوتر نے یہ کہا اور اسے لگا جیسے کبوتر کی آنکھوں میں آنسو ہوں۔''(۳۲)

بیٹے کی پیدائش سے قبل بھاگو کے خواب کی وضاحت مابعد الطبیعیاتی تناظر میں کی جاسکتی ہے۔عالیشان قسم کے پتھروں کی مسجد کے منبر کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر سرخ گلاب اُبھرا ہے۔دیکھتے دیکھتے وہ بڑا ہو جاتا ہے اور اس کی جھولی میں آجاتا ہے اور بھاگو کو محسوس ہوتا ہے کہ اس پھول کی پتیوں سے بڑے بڑے قلعے اور محلات بنتے جارہے ہوں۔ابوالفضل اور اس کی بیوی بھاگو نے چوتھے بیٹے کی پیدائش پر بہت عجیب خواب دیکھے۔ ابوالفضل نے تاروں بھرا آسمان دیکھا۔ایک تارا بے حد روشن ہو کر چاند جیسا بن جاتا ہے۔ابوالفضل اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ہاتھ سے کانچ کی تھالی کی طرح پھسل جاتا ہے اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔یہ خواب اپنے اندر ایک جہانِ معنی سموئے ہوئے تھے۔اسی طرح ابوالفضل کی بیوی بھاگو کے خواب میں بیٹے کے مستقبل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ابدال بیلا نے خوابوں کی مدد سے کہانی میں تحیر اور پراسراریت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

''ایک دریا کنارے باغ ہے۔ہرا بھرا خوشنما پھولوں کے تختوں سے لدا ہوا۔وہیں سنگِ مرمر کی ایک بنی بارہ دری ہے۔میں اس میں مہارانی کی طرح بیٹھی ہوں۔نوکر مور پنکھ جھل رہے ہیں۔پرندے خوش الحانی سے گیت گا رہے ہیں۔اتنے میں باغ کا مالی، جس کے چہرے پہ درویشوں جیسی روشنی ہے، مجھے ایک بڑا سا کاسنی کا پھول لا کے دیتا ہے دو ہاتھ چوڑا پھول ہے اسی طرح کا جیسا فضل کی ولادت سے پہلے خواب میں ملا تھا میں پھول لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں کرتی، جھولی کھول کے پھیلا دیتی یوں۔وہ درویش پھول جھولی میں ڈالتا ہے تو مجھے پھول کا بھاری پن محسوس ہوتا ہے۔جھولی کی کنی سرک جاتی ہے۔میں پھول پکڑنے کو لپکتی ہوں تو آنکھ کھل جاتی ہے۔''(۳۳)

ابوالفضل کے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں سنیاسی بابا کی پیشن گوئی کے ذریعے اسرار اور تحیر بھری فضا کی موجودگی یقینی بنائی گئی ہے۔سنیاسی بابا کہتا ہے کہ بیٹا بے شک تیرا ہے لیکن اس کے مقدر میں راج

سنگھاسن کی راج گدی ہے۔ راج آگیا کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس کا نصیب بہت بلند ہے۔ میں لکھ کے دینے کو تیار ہوں میرا وچن یاد رکھنا۔

''جوان شیخی نہیں مارتا، پر نتو ناسوت کے ساتوں پرت اوش دیکھ لیتا ہوں۔ اجل رسیدہ ناسک ہوں، ناستک ناہی۔ اکو ایشور رب کو راہر و مانتا ہوں میرے حساب میں کبھی بال جتنا فرق نہیں نکلا۔ یہ اجل شدھ پیش بینی ہے۔ تم یاد رکھنا۔ کہا سنا معاف کرنا۔ تمہی اب نائیک ہو، منصف ہو، نیائی کہ دی۔ اب چلتا ہوں۔ وقت نیائک ہے۔ اکاش لوچن پہ چڑھ کے تارے توڑ لاتا ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی دکھا دیتا ہے۔ دکھا دے گا۔ ہری اوم، رب را کھا۔''(۳۴)

بھاگو کے بیٹے کے لاپتہ ہونے کی شکل میں ابدال بیلا یہ ماورائی صورت سامنے لائے ہیں کہ کیسے ایک دکھیا اور بے بس ماں کے دل سے نکلی بد دعائیں عرش ہلا دیتی ہیں اور قدرت اس ماں کا انتقام لینے پر تیار ہو جاتی ہے۔ مجبور اور بے بس ماں کی بد دعائیں اثر لاتی ہیں اور اس کے بیٹے کے اغوا کی ذمہ دار سندر کور کے تینوں بیٹے تھوڑے ہی عرصے میں یکے بعد دیگرے مر جاتے ہیں۔

''بیچاروں کا گھر اجڑ گیا۔ تینوں بیٹے اوپر تلے مر گئے۔ ان کا کچھ بھی نہیں بچا۔ لگتا ہے کسی کی نظر لگ گئی، کوئی بد دعا انہیں کھا گئی۔ ہاں میری بد دعا لگی ہے انہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کو اُٹھانے والے کو بد دعائیں دی تھیں۔''(۳۵)

ڈر اور خوف انسانی فطرت میں شامل ہیں۔ قبرستان اور ان میں موجود روحیں مل کر ایک اساطیری فضا کو سامنے لا رہی ہیں۔ قبرستان ہمیشہ سے دہشت اور خوف کی علامت رہے ہیں، جنہیں مرنے والوں کی روحوں کے علاوہ بھوت پریت کا مسکن سمجھا جاتا ہے۔ ''میں'' جب رات کے وقت ''تم'' کے ساتھ ایک قبرستان جاتا ہے تو خوف اور دہشت کی فضا قائم ہوتی نظر آتی ہے۔

''ایک دم سے سناٹا گونجنے لگا۔ جیسے قبرستان میں مدت سے سوئی ہوئی روحیں ایکا ایکی میں اٹھ کے بیٹھ گئی ہوں۔ میرے جسم پر چیونٹے رینگنے لگے۔ ہاتھوں میں لرزا آگیا۔ منہ میں تھوک جم گیا۔ حلق کو تالے لگ گئے۔ شاں شاں کرتی خاموشی میں پورے قبرستان کی روحیں ہمیں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔۔۔ میں اپنے اور تیرے قدموں کے رکنے

سے سہم گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے قبروں میں لیٹی ہوئی روحیں ایک دم سے کروٹ بدل کے مجھے تکنے لگی ہوں اور تکتی تکتی سیٹیاں بجانے لگی ہوں۔"(۳۶)

بابے، جوگی، سنت، سنیاسی، فقیر، مردِ قلندر وغیرہ یہ سب اساطیری کردار ہیں جن کی مدد سے تحریر میں اساطیری حسن اور اسرار پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ ان فوق البشر انسانی ہستیوں کا انسانی زندگی میں عمل دخل ماورائے عقل واقعات کو سامنے لاتا ہے۔ بابا محکم دین نے مخلوقِ خدا سے بھاگ کر قبرستان میں اپنا ڈیرہ لگالیا۔ ایک آدمی وہاں بھی آگیا۔ بابا نے جانے کا کہا مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے انکار اس کی جان لے گیا۔ ابدال بیلا نے اس حادثے کو بابا کے ساتھ منسوب کر کے اسرار اور تحیر کا ماحول پیدا کیا ہے۔

"بابا غور سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے بابا نے آنکھیں بند کر لیں اور آنکھیں میچے میچے بابا کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔ ٹھوڑی اس کے سینے سے لگنے لگی۔ کہتے ہیں کوئی پونے سات منٹ ہوئے ہوں گے کہ ساتھ والی قبر کے اوپر اُگی جھاڑی میں سے ایک پھنیر سانپ نکلا اور آناً فاناً اس آدمی کو ڈنگ مار کے پلٹ گیا۔"(۳۷)

مختلف اساطیری حوالے اس بات کو بین بیان کرتے ہیں کہ بددعا (شراپ) نسل در نسل سفر کرتی ہے۔ دیومالائی کہانیوں میں اکثر یہ اساطیری جہت بہت بھرپور انداز میں بیان کی گئی ہے۔ ابدال بیلا نے اس عقیدے کی مدد سے ایک پُراسرار حقیقت کو بیان کیا ہے۔ بابا محکم دین لاڈو کی شادی سے پہلے کہتا ہے کہ جس نے میری لاڈو کو رُلایا اس کا بہت برا حشر ہو گا۔ لاڈو کے سسرال والے اسے مار کر گھر سے نکال دیتے ہیں۔ لاڈو روتی ہوئی بابا کے پاس آتی ہے۔ بابا سخت غصے میں آجاتا ہے۔

"میں نے پہلے ہی کہ دیا تھا کہ میری بیٹی لاڈو سے ان ملہوتروں نے تاراج کئے شہر جیسا سلوک کیا تو ان کی پوری بستی قیامت تک تاراج رکھوں گا۔ کل تماشا دیکھنا۔ یہ کہ کے بابا اپنے قبرستان آگیا۔ ادھر صبح ہونے سے پہلے ہی لاڈو کے سسرال کا پورا گاؤں پاگل ہو گیا۔ لوگ دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے۔ سر چھل گئے۔ لہولہو ہر گھر ہو گیا۔"(۳۸)

لوگ بابا سے معافی مانگنے آتے ہیں۔ اس موقع پر بابا معافی تو دے دیتا ہے مگر ساتھ ہی کہتا ہے کہ ہر سال آج ہی کے دن سارے گاؤں والے بابا کے پاس آئیں گے۔ بابا کو مرے برسوں گزر گئے ہیں مگر آج بھی ہر سال اس گاؤں کے لوگ بابا کے مزار پر حاضری دیتے ہیں جو ایسا نہ کرے اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔

جوگی وہ لوگ ہوتے ہیں جو نروان حاصل کرنے کے لیے دنیا سے منہ موڑ کر جنگلوں اور بیابانوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب جوگ میں پڑتے ہیں، اپنی بدن بولی پر قابو پا لیتے ہیں تو ان سے عجیب و غریب اسرار ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جن کی تعبیر عقل کے ہاتھوں ناممکن ہے۔ ابو الفضل کے ہاتھوں پکڑا گیا ایک جوگی اپنے گرو کے بارے میں حیرت انگیز اور پُر اسرار انکشافات کرتا ہے۔

> ''مہاراج ! گرو تو میرا بیس بیس دن زمین میں دفن پڑا رہتا ہے۔ کون ہے وہ؟ کدھر ہے۔ رام جانے کوئی ٹھکانہ تھوڑی ہوتا ہے گرو کا۔ کبھی کہیں کبھی کہیں۔ ننگے پاؤں جلتے کوئلوں پہ چلنا پھرنا اس کی عادت ہے آگ دہکی ہوتی ہے، کوئلے سلگ رہے ہوتے ہیں، اسے کچھ نہیں ہوتا۔ پہلی بار دکن میں کہیں میں نے اسے آگ پہ چلتے دیکھا تو پھر اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا ڈیڑھ سال تک اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ ننگ دھڑنگ رہتا تھا وہ۔ جبڑا اپنا اس نے لوہے کی تار سے باندھا ہوا تھا کہ منہ میں کوئی مکھی مچھر نہ چلا جائے۔ کسی کھانے کی خوشبو سے منہ کا سواد نہ جاگ جائے بس پانی پیتا تھا، دودھ بھی پی لیتا تھا، اور کچھ نہیں۔''(۳۹)

اپنے نفس پر قابو پا کے یہ ہر رستے سے بے خوف گزر جاتے ہیں۔ یوں ایک اساطیری فضا کی بازیافت ممکن ہو پاتی ہے۔ کسی نے ساری زندگی کیلوں پر لیٹ کر گزار دی اور کوئی کشمیر کے برف بھرے پہاڑ پر لنگی باندھے لیٹا رہا مگر اسے ٹھنڈ نہ لگی۔ کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ سیک تو بندے کے اندر ہوتا ہے۔

ابدال بیلا نے اساطیری علائم ''طلسماتی شہر'' اور ''روح'' جیسی علائم کی مدد سے انگریز سرکار کے ہاتھوں دہلی کی تباہی کے منظر کو اساطیری رُخ دیا ہے۔ ارجمند بانو اپنی بیٹی چاند بانو کے ساتھ دہلی سے رختِ سفر باندھتی ہے اور اپنی بیٹی کو منع کرتی ہے کہ

> ''اب کبھی کہیں رک کے نہ دیکھنا۔ یہ طلسماتی شہر ہے۔ یہاں مڑ کے دیکھنے والوں کی روحیں لال قلعوں، میناروں اور حویلیوں میں ٹنگی رہ جاتی ہیں اور وہ خود بنا روح کے جسم لیے راستوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ چل بیٹی۔ سیدھا دیکھ۔''(۴۰)

ہندی اساطیر میں ایسی مثالیں جا بجا ملتی ہیں کہ کیسے ایک انسان کی روح انتقام لینے کی غرض سے دوسرے انسان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ ابدال بیلا نے دیوآنند کے جسم میں شہنشاہ جہانگیر کی روح کے

داخل ہونے کے عمل سے خوف اور دہشت کی فضا قائم کی ہے۔ دیوآنند جہانگیر بادشاہ کی قبر کو ٹانگیں مارتا ہے اور گستاخی کرتا ہے اور جہانگیر کی روح اس کے جسم میں حلول کر جاتی ہے۔

''ایک دو لمحے دیوآنند کے اندر عجیب طرح کی پٹخا پٹخی ہوئی، چہرہ لال بھبوکا ہو گیا آنکھوں کے ڈیلے شیر کی آنکھوں کی طرح ہولناکی سے پھیلے، ہونٹوں کو دانتوں میں کھینچ کے چبایا گیا۔ نتھنے پھیل گئے۔ پھر کہنی گاؤ تکیے پر ٹیک کے بائیں ٹانگ کا گھٹنا اٹھا کے، بائیں ہاتھ کو ناک کے قریب پھول سونگھنے کے انداز میں لا کر دیوآنند کے اندر ٹھہری ہوئی ہستی کی آواز آئی۔ ہم شہنشاہِ ہند جہانگیر ہیں۔''(۴۱)

آئمہ کرام کو اسلامی اساطیر میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ابدال بیلا نے امام پاک کے ذکر سے کہانی کا رشتہ اساطیر کے ساتھ قائم کیا ہے۔ سائیں بگو شاہ دریا کے کنارے رمبے کی مدد سے گھاس کھود رہا تھا کہ اسے چکر آیا اسی دوران اسے سریلی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔

''سائیں نے ادھر گردن موڑی تو سامنے بیس قدم کی دوری پہ ایک سفید روئی کا کپا چلا آرہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس ایک سفید ریش بزرگ۔ ہاتھ میں اس کے گرز تھا گرز سے گھنٹیاں بندھی تھی وہ گرز زمین پہ مارتا اس طرح چلا آرہا تھا، جیسے سوئی ہوئی زمین کو جگاتا آرہا ہو۔ سائیں کے قریب آیا تو بولا، ادب سے کھڑے ہو جاؤ، امامؓ کی سواری آرہی ہے۔''(۴۲)

مذہبی پیشواؤں کے نام پہ کیسے سیدھی سادی عوام کو بے وقوف بنایا جارہا ہے۔ ابدال بیلا نے اپنے دور کے اس مسئلے کو اساطیری حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ سکھوں نے گردوارہ بنانے کا اعلان کیا اور پیسے اکٹھے کرنے شروع کیے۔ اس موقع پر ویر سنگھ نے چالاکی کی اور جھوٹے خواب بتا کر لوگوں کو گمراہ کیا کہ اس نے چاروں گرو کو خواب میں دیکھا ہے۔ انہوں نے نشانیاں بتائی ہیں کہ کس جگہ پر گردوارہ بنے گا۔

''چاروں گرو گھاس پہ بیٹھے تھے، سچے تلے والی شنیل کی نیلی چادر بچھا کے، ٹھنڈی ٹالی کی چھاؤں میں۔ ادھر گرو امر داس جی بیٹھے تھے۔ یہ ساتھ گرو رامداس جی، باقی دونوں مسکرا کے ہم تینوں کا دیکھ رہے تھے۔ تو ادھر آجا، آجا میرے پاس، تیجا سنگھ تو نے پانی کا گلاس بھر کے پلایا تھا گرو امر داس جی کو۔ ادھر دونوں کے سامنے کھالے کی طرف ادھی

گرنتھ گروار جن جی بیٹھے تھے۔ ساتھ داسام گرنتھ گرو گوبند سنگھ جی، وہ دونوں شطرنج کھیل رہے تھے۔ دوسرے دونوں گرو سرکار بیٹھے انہیں دیکھ دیکھ خوش ہو رہے تھے۔ شرطیں لگا رہے تھے، کون جیتو۔ ٹالی کی دھوپ چھاؤں میں چمکتے پتوں کی طرح کا ساوار نگ تھا شطرنج کے مہروں کا۔''(۴۳)

پُر اسرار تحیر آمیز فضا پیدا کرنے کے لیے ناول نگار نے کئی اساطیری عناصر کی مدد حاصل کی ہے۔ خوابوں کی مدد سے مابعد البطیعیاتی جہت کو واضح کیا گیا ہے۔ خوابوں میں پوشیدہ اسرار اور پیغام قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں پیشن گوئی مابعد الطبیعات کا حصہ ہے۔ اساطیر میں شراپ نسل در نسل سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' میں بھی ہم اس چیز کو دیکھ سکتے ہیں کہ بابا محکم دین کے مرنے کے بعد بھی گاؤں کے لوگ ہر سال ان کے مزار پر ضرور جاتے ہیں۔ اپنے نفس کو زیر کرنے اور نروان حاصل کرنے کے لیے جوگی اپنی جان جوکھم میں ڈالتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ روح، طلسماتی شہر، قبرستان، امام پاک کی آمد اور چاروں گرو کے ذکر سے ابدال بیلا نے اپنے فن اور تخیل کی مدد سے اساطیری صداقتوں کو بیان کیا ہے۔

ج۔ جادو ٹُونہ

جادو ٹُونہ قدیم اساطیر کا اہم حصہ رہا ہے۔ جادو کی مدد سے اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانا اور انہیں زیر کرنا انسان کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ اسلامی اساطیر میں بھی اس کا ذکر ہاروت اور ماروت کے قصے میں ملتا ہے۔ نیز یہود و ہنود بھی عملیات میں ماہر تھے۔ یہ شیطان کا پسندیدہ عمل ہے۔ ابدال بیلا نے منتروں اور جادو کے ذریعے دیومالائی فضا پیدا کی ہے۔ کالے علم والے جوگی نے لڑکی والوں کے کہنے پر ابوالفضل کو مارنے کے لیے ہانڈی کی مدد سے جادو کیا۔ سات چڑیلوں کو بلانے والا منتر پڑھا۔ سب سے بڑی چڑیل کلر کی رانی تھی۔ اسی کا نام لے کر سب کو بلاتے تھے۔

''ہنڈیا اُڑ گئی۔ گول گھومی پھر ہوا میں جا کے گھومتی گھومتی لاٹو کی طرح ابوالفضل کے گاؤں کی طرف رُخ کر لیا۔۔۔ جدھر سے گزرتی تھی۔ سیٹی کی آواز آتی تھی۔ شوں شوں، جیسے کوئی گھومتا ہوا لاٹو اُڑتا پھرے۔ پہنچ گئی ان کے گاؤں۔ ادھر ابوالفضل اپنے گھر سے باہر کھیل رہا تھا، گلی میں پہنچا تو وہ پہنچ گئی۔ شوں شوں کرتی ہوئی کوئی چیز آئی اور ٹھاہ سے

اس کے سینے پر پڑی۔"(۴۴)

جوگی کے جادو کا انت کرنے کے لیے خیراتی شاہ نے بھی منتر پڑھ کر کلر کی رانی کو بلایا۔اس کے لیے سات پراٹھے پہلے سے تیار تھے۔ایک دم سے شوں شوں کرتی ہوئی ہانڈی لٹو کی طرح گھومتی آئی۔اندر اس کے آگ جل رہی تھی۔ٹرے پہ ہانڈی نے جھپٹا مارا اور ساری چیزیں اُٹھا کے اسی طرح شوں شوں کرتی نظروں سے دور ہو گئی۔یوں ابوالفضل جادو سے بچ گیا۔

بنگال ایک جادو نگری کے طور پر مشہور ہے۔انگریز فوج کے بنگال قیام کے دوران اس میں شامل ایک مقامی سپاہی غلام محمد نیازی ایک بستی سے مرغیاں چُرا کر کھاتا تھا۔بستی والے اس سے بہت تنگ تھے۔ایک دفعہ اس نے بکرا اُٹھالیا۔بستی والے اسے ایک بوڑھی جادو گرنی کے پاس لے آئے اس نے اپنے جادو کے زور سے غلام محمد نیازی کو گدھا بنا دیا۔

"اس عورت نے اپنی چارپائی کے نیچے ایک پانی سے بھرا گلاس اٹھایا۔اس میں اپنی انگلیاں ڈبوئیں اور پھر ان انگلیوں پہ ٹپکتی بوندوں کو نیازی کے چہرے پہ جھٹک دیا۔نیازی بے ہوش ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس کی روح فنا ہو گئی۔اس کا جسم اسے انسانی شکل کے بجائے ایک گدھے کی شکل میں نظر آیا۔چار ٹانگیں، دھڑ، کمر اور تھوتھنی۔پورے کا پورا گدھا۔حلق میں انسانی آواز کی بجائے گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں۔اسی دوران اس جادو گر بستی کے لوگ ہاتھوں میں سوٹیاں ڈنڈے لے کر اس پہ پل پڑے۔لاٹھیاں مار مار کے انہوں نے اس کی کمر ہلا دی۔اس کی زبان باہر آگئی اور وہ اپنی چاروں ٹانگوں کو پھیلا کے ٹوٹی کمر کے ساتھ بوڑھی عورت کی چارپائی کے سامنے گر گیا۔پھر اسے بوڑھی عورت کا لرزتا ہوا ہاتھ ہلتا ہوا نظر آیا۔جیسے وہ بستی والوں کو منع کر رہی ہو اسی دوران اسے پھر اپنے جسم پہ اس جادو گر عورت کے ہاتھ سے نکلے پانی کی چھینٹے پڑے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ہوش آیا تو وہ پھر انسانی جسم میں تھا۔"(۴۵)

ابدال بیلا کے تخیلاتی جہان کے داخل سے مابعد الطبیعیاتی جہت پھوٹتی نظر آرہی ہے۔واقعے میں اساطیری رنگ اس وقت مزید نمایاں ہوتا ہے جب میجر بمبر کو اس بات کی خبر ہوتی ہے۔وہ سپاہیوں کو ساتھ لے کر بڑھیا سے ملنے جاتا ہے۔میجر کی فرمائش پر بوڑھی جادو گرنی صدر کو عورت بنا دیتی ہے۔

''جب اسے ہوش آیا تو وہ میدان میں لیٹا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد دائرہ بنا کے اس کے ساتھی گردنیں جھکائے ہونق چہروں سے پریشان کھڑے تھے۔۔۔اچانک صدر کو محسوس ہونے لگا جیسے اس کے جسم میں کچھ عجیب طرح کی تبدیلی آرہی ہو۔جیسے پچکے ہوئے فٹ بال میں کوئی پمپ سے ہوا بھر رہا ہو اور فٹ بال دھیرے دھیرے ابھر رہا ہو۔اسے اپنی وردی کے سینے کی دونوں جیبیں ابھرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ایکا ایکی میں وہ اتنی ابھر آئیں کہ قمیص کی سلائیاں تن گئیں۔اس نے گردن گھما کے ٹھوڑی سینے سے لگا کے اپنا سینہ دیکھا۔۔۔اس کے ارد گرد دائرے میں کھڑے اس کے ساتھیوں کے حلق سے حیرت بھری آوازیں نکلیں۔۔۔صدر کا پورا جسم ایک دوشیزہ کا تھا۔''(۴۶)

اساطیری قصے کہانیوں میں جادو گروں اور جادو کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ابدال بیلا نے بھی جادو کے ذکر سے ایک ایسے ماورائی جہان کی منظر کشی کی کوشش کی ہے جو قاری کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ابوالفضل کے سسرال والے رشتے سے انکار پر انتقام لینے پر تُل جاتے ہیں اور اس پر جادو کر دیتے ہیں اور جادو کی ہانڈی گلیوں سے گھومتی ہوئی آکے اس کے سینے سے ٹکراتی ہے۔اسی طرح انسانی عقل اس وقت دنگ رہ جاتی ہے جب بنگال کی جادو گرنی محمد نیازی کو گدھا بنا دیتی ہے اور صدر کو جسمانی لحاظ سے ایک عورت کے وجود میں بدل دیتی ہے۔یوں ہئیت کی تبدیلی عمل میں آتی ہے جو قاری کو حیران کر دیتی ہے۔ابدال بیلا قاری کو سحر میں مبتلا کرنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں اور اساطیر کے حوالے سے آپ نے اپنے فن کا استعمال بہت عمدگی سے کیا ہے۔

د۔ماورائے عقل عناصر:

اسطور کا محرک تحیر ہے۔ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں تحیر کا ایک جہان آباد ہے۔ایسے ماورائے عقل واقعات آپ کی تحریر کا حصہ ہیں جو قاری کو ایک جہانِ حیرت میں گم کر دیتے ہیں۔ان واقعات کی کوئی سائنسی اور عقلی توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ناول کے باب تین ''صاحباں'' میں سوڈی شاہ کی شکل میں ہمیں ایسا ہی کردار دیکھنے کو ملتا ہے۔جس سے محیر العقول واقعات سرزد ہوتے ہیں۔اس سے ملتے جلتے واقعات کی مثالیں اسلامی اساطیر میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔سوڈی شاہ ایک اساطیری کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور ایک ماورائے عقل واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔

''بیل کے بِن سانس کے نتھنوں اور بجھی ہوئی آنکھوں پہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سوڈی شاہ نے بیل کی کمر پہ تھپکی دی، اور بولا اوئے تو کمرے کے اندر کیوں مر گیا، اس غریب کی چھت کا کیوں ویری ہو گیا۔ چل اُٹھ میرا سوہنا، باہر جا کے سو جا۔ پھر تھپکی دی۔ دو دن کے مرے ہوئے پھولے بیل کی لاش کی ساری کھال میں سر سراہٹ ہوئی، مکھیاں اس کے نتھنوں سے یکا یک اُڑیں، اس کی آنکھوں میں روشنی ہلی، اس کی ڈھیلی گری ٹانگوں میں حرکت ہوئی اور ایک دم سے اس کا پورا گارے مٹی کے پہاڑ جیسا بے جان وجود اُٹھ کے کھڑا ہو گیا اور وہ اپنی چاروں ٹانگوں سے چلتا چلتا خاموشی سے دروازے میں سے گزر کے باہر گلی میں آیا اور دھپ سے پھر گر گیا مکھیاں پھر سے اس کے نتھنوں اور آنکھوں میں گھس گئیں۔''(۴۷)

سوڈی شاہ کے کہنے سے ایک مردہ بیل زندہ ہو کر کمرے سے باہر نکل کر آیا اور باہر آکر مر گیا۔ ابدال بیلا نے اس واقعے کی مدد سے اساطیری جہت کی منظر کشی کی ہے۔ اسی طرح سوڈی شاہ کی آخری خواہش کی مدد سے ابدال بیلا نے کہانی میں ماروائیت پیدا کی ہے۔

''بابا سوڈی شاہ بھی نہیں مانتا تھا۔ مرتے سمے بھی اڑی کر گیا۔ مرنے سے پہلے ڈیرے پہ کہہ دیا۔ میرا گرو سائیں بگو شاہ ہے۔ اس سے میرا جنازہ پڑھوانا مر گیا، گرو اس کا نہ ملا لوگوں نے ناچار جنازہ پڑھایا۔ دفنانے لگے تو قبر میں نہ اُترے۔ جو قبر کھودیں، وہ چھوٹی ہو جائے، میت پھیل جائے۔''(۴۸)

''دروازہ کھلتا ہے'' کے باب ''ابوالفضل'' میں ابوالفضل کے منتر سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ چلہ کرتا ہے۔ چلہ کشی کے دوران اسے عجیب و غریب واقعات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اسے پیش آنے والے محیر العقل واقعات خوف کی فضا پیدا کرتے ہوئے قاری کو ایک الگ اساطیری جہان کی سیر کرانے لے جاتے ہیں۔

'' چوتھی رات آئی۔ ابھی پہلی تسبیح ہی پوری ہوئی تھی کہ ایک دم سے شوں شوں کر کے کوئی شرلی چلی۔ پھر بم پھٹا زور کا دھماکہ ہوا اور یک لخت دن چڑھ گیا۔ روشنی ہو گئی۔ ہر چیز صاف صاف دکھائی دینے لگی۔۔۔ ایک ٹہنی پر ایک کالا کوا بیٹھا تھا۔ وہ کائیں کائیں

کرے۔۔۔رات کا پہلا پہر تھا۔ایک دھماکے سے یک لخت وہ دن کا تیسرا پہر بن گیا۔ عجیب طرح کی خاموشی پورے ماحول میں بھر گئی۔ صرف کوے کی کائیں کائیں کی آواز آتی رہی۔ پھر پراسرار طریقے سے کوا بھی خاموش ہو گیا۔ جیسے کسی سانپ نے اچھل کے اسے ڈس لیا ہو۔ابوالفضل کے لہو میں برف کی ڈلیاں چلنے لگیں۔اس کی نس نس منجمد ہو گئی۔اسے اپنی کھال کے نیچے سرسراہٹ محسوس ہوئی۔اچانک ہی اس کے قریب ہی کوئی چیز رینگتے ہوئے اُچھلی۔ نگاہ ادھر کی تو کوئی دس ہاتھ لمبا کالا سیاہ ناگ پھن پھیلائے اس کی طرف لپکا۔''(۴۹)

تحیر، ڈر اور خوف کی فضا نیز غیر معمولی واقعات ایک مابعد الطبیعیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جہاں قاری خود کو اس ماحول کا ایک جز سمجھتا ہے۔ مافوق الفطرت جزئیات سے بھرے مزید کئی مناظر ہمیں ناول میں دیکھنے کو ملتے ہیں، جب چلہ کشی کے دوران ابوالفضل کو کالی گھپ ڈراؤنی رات میں کالی سیاہ بلی نظر آتی ہے جو بیٹھے بیٹھے نوکیلے پنجوں، لال دہکتی آنکھوں، گندے میلے خونخوار دانتوں والی خوفناک چڑیل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زمان و مکان کا بُعد تحریر میں اساطیری جہت نمایاں کرتا ہے۔ مصنف نے زمان و مکان کا التباس اُٹھا کر ایک مابعد الطبیعیاتی تصور پیش کیا ہے۔ ''میں''، ''تم'' سے کہتا ہے کہ

''تمہارے ہاتھ وقت کے سمندر کو چھو کے آئے ہیں۔اسی سمندر کے ساحل تو ہم کئی بار ملے تھے۔جب نہ چاند بنا تھا نہ سورج۔نہ زمین آسمان سے اتری تھی۔نہ ہم زمین پہ اُتارے گئے تھے۔اس وقت ہم ایک ہی پیڑ کے دو پھول تھے۔ میں تھا اور تم میرے سینے میں عین دل کی جگہ پہ چبھی ہوئی تھی۔''(۵۰)

اسی طرح جو شخص روحانیت میں کمال حاصل کر کے مردِ مومن بن جاتا ہے، زمان و مکان کی پابندیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ وقت اس کا غلام ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں چاہے وہاں جا سکتا ہے۔ سرون سنگھ اپنی بیوی چندر کور کو چھوڑ کر سات سمندر پار چلا گیا۔ کئی سال گزر گئے نہ آیا۔ چندر کور سائیں بگو کے پاس اپنی فریاد لے کر آتی ہے تو سائیں اس کی مدد کی ہامی بھر لیتا ہے۔

''سائیں ڈاڈھا آدمی تھا۔اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ کئی راتیں کھڑا رہا۔ کوئی چلہ کیا یا وظیفہ۔ بہر حال کھڑے کھڑے پہنچ گیا ایک دن لندن کی بندرگاہ پہ۔۔۔وہیں بندرگاہ پہ

سامان لادنے والوں میں مزدور کے کپڑوں میں ملبوس سرون سنگھ کھڑا تھا۔"(۵۱)

دیوآنند جہانگیر بادشاہ کی قبر کی بے حرمتی کرتا ہے اور اسے پاؤں مارتے ہوئے ہنسنے کی کوشش کرتا ہے تو اچانک اس کی حالت بگڑنے لگ جاتی ہے۔ گویا کوئی غیر مرئی مخلوق اس پر حملہ آور ہو گئی ہو۔ دیوآنند کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے محیر العقول صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے۔

"ابھی اس کے ہنسنے کی آواز کی "ہی" ہی نکلی تھی کہ وہ عجیب سی خوفناک خرخرے میں بدل گئی، جیسے کسی نے مٹھی میں اس کا گلا ایکا ایکی دبوچ لیا ہو، اس کی آنکھوں کے ڈیلے ایک لمحے کو ادھر اُدھر سرکے، پھر گھول گھومتے ہوئے اوپر چڑھ گئے۔ چہرے کے خدوخال ایسے بگڑ گئے جیسے کسی نے گیلے گیلے رنگوں سے تصویر بنا کے اوپر ہاتھ پھیر دیا ہو۔ گلے کے پٹھے اکڑ گئے۔ اس کی چیخ بڑھتی رہی جیسے اس کا سانس بند ہو رہا ہو۔ رنگ اس کا پہلے سرخ ہوا، پھر نیلا نیلا ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کے دونوں بازو اندر کو مڑ گئے۔ جوتوں کے تسمے اس کے ہاتھوں پہ عجیب انداز میں لپٹ گئے۔ تسمے باندھنے کے لیے وہ پہلے ہی نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس کی گردن لمبی ہوتی ہوئی اس کی ٹانگوں کے اندر پتلون کے آسن میں گھس گئی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔"(۵۲)

جب دیوآنند کی حالت بہت خراب ہو جاتی تو اس کے پاس کلامِ پاک پڑھا جاتا۔ کلامِ پاک کی برکت سے دیوآنند کی طبیعت سنبھل جاتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ غیر مرئی مخلوق قرآن پاک کی آیات پر غور و فکر میں مصروف ہو۔

ماورائے عقل عناصر کی مدد سے مصنف تحریروں میں اساطیری ابعاد سامنے لاتے ہیں۔ محیر العقول واقعات میں تحیر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بابا محکم دین، گوپال سنگھ کے ہاں دعوت پر آتا ہے تو آتے ہوئے ایک گائے کی ٹانگ کی ہڈی تحفے کے طور پر لے آتا ہے۔ جو وہ لوگ سنبھال کر صندوق میں رکھ لیتے ہیں۔ لاڈو کی شادی پر بابا کی اجازت سے جب صندوق خالی کرنے لگتے ہیں تو حیرت کے مارے گنگ ہو جاتے ہیں۔

"لالٹین کی لو ادھر کی اور غور سے صندوق کے اندر تکنے لگی۔ دونوں میاں بیوی کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے سر چکرانے لگے۔ آنکھیں پیٹی کے اندر دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ ان کے روبرو ان کے صندوق میں گائے کی وہ پوری ٹانگ کی ہڈی سارے کی ساری خالص

سونے کی بنی ہوئی پڑی تھی۔"(۵۳)

علی شیرِ خدا ایک اساطیری کردار ہیں۔ان کی ہمت ، شجاعت اور بہادری کی داستانیں زبانِ زدِ عام ہیں۔آپ کا نام سنتے ہی آپ کی زندگی کے تمام پہلو آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ابدال بیلا نے آپ کے ذکر سے کہانی میں ماورائیت بھی پیدا کی ہے۔سائیں پلیگ کے دنوں میں خوف زدہ ہو روشن ولی کی درگاہ پر چلا گیا، وہاں اس کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

"سائیں نے چادر اوپر تانی اور سر منہ لپیٹ کے لیٹ گیا۔جو جو پڑھا کرتا تھا، پڑھتا رہا۔کوئی گھنٹہ گزرا ہو گا کہ چادر کے اندر سے سائیں کو باہر روشنی کا گولہ نظر آیا۔جیسے کوئی گیس کا ہنڈا سرہانے آ کھڑا ہوا ہو۔ابھی سائیں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کون گیس جلا کے ادھر آ گیا کہ ایک سوٹے کی انی اس کی دائیں پسلی میں چبھی۔اندر کھب گئی۔آواز آئی۔اوئے، تو ادھر کیوں آیا۔شیرِ خدا کا اسم پڑھنے والے! بول۔کڑاکے دار آواز تھی۔سائیں نے جھٹ چہرے سے چادر کھینچی، دیکھا سامنے طویل قامت مضبوط جسم کا سپاہی کھڑا ہے۔چہرہ گیس کا منور ہنڈا بنا ہوا ہے۔ہاتھ میں موٹا سا سوٹا ہے۔سوٹے کی انی پہ لوہے کی میخ چڑی ہے۔"(۵۴)

اسی طرح ناول میں کھلی آنکھوں والا کٹا ہوا سر خوف اور دہشت کی فضا قائم کرتا ہے۔امام پاک کی سواری کے احترام میں بگو شاہ کھڑا ہوتا ہے تو سواری کے گزرنے کے بعد اس کی نظر کلس پر پڑتی ہے تو وہ تڑپ جاتا ہے۔

"وہاں ایک ڈوری سے اس کے گرو بابا نور پوریے مست کا گردن سے اوپر اوپر کٹا ہوا سر بندھا ہوا تھا۔کلس کے گرداگرد ہوا میں کٹا ہوا سر جھولتا ہلتا جا رہا تھا۔آنکھیں سر کی زندہ تھیں، اور مسکراتے ہوئے سائیں کو تکے جا رہی تھیں۔"(۵۵)

جب بندہ اللہ پاک کا مطیع ہو جاتا ہے تو سارا جہان اس کا مطیع ہو جاتا ہے اور اس سے محیر العقول واقعات پیش آتے ہیں۔پلیگ کے دنوں میں سائیں کو خواب میں اشارہ ہو جاتا تھا کہ صبح کس کس کی موت واقع ہو جائے گی۔اسے مہر لگانے والے نظر آتے تھے اور جسے وہ مہر لگاتے تھے اگلے دن اس کا جنازہ اُٹھ جاتا تھا۔ایک دن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس فہرست میں سائیں کا اپنا نام شامل ہو گیا۔سائیں بہت گھبرایا۔سائیں اپنی جھونپڑی میں لیٹا ہوا تھا کہ اچانک روشنی ہو گئی اور اسے مہر لگانے والے نظر آئے۔اس موقع پر قاری کو اساطیری حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''مہر والے نے سیاہی میں مہر ڈبوئی اور سائیں کے سینے پہ مہر لگانے کو جھکا، ابھی اس کا ہاتھ سائیں کی بغل سے دو ہاتھ اوپر ہی تھا کہ جھونپڑی کے ایک کونے سے شیر کی دھاڑ اٹھی۔ ایک دم سے ایک ببر شیر اچھل کے سامنے آگیا اور دھاڑتے ہوئے بولا، بھاگ جاؤ، جا کے کہ دینا تیرے شیر نے بھگا دیا ہے۔ وہ دونوں ببر شیر کی دھاڑ سن کر لرزنے لگے اور کانپتے کانپتے الٹے پیروں بھاگ گئے۔''(۵۶)

اپنی زندگی میں انسان کا واسطہ ایسی غیر مرئی صورتِ حال سے پڑتا ہے کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی طاقت مفقود ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسانی زندگی میں ایسے حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی توجیح پیش نہیں کی جاسکتی۔ ساہو کار لالہ رام دیو کو نمبردار ہر بچن سنگھ شدید بارش میں قتل کرتا ہے۔ چشم دید گواہ بارش کے قطرے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر لالہ رام دیو کہتا ہے کہ اس کے قتل کی شہادت بارش کے قطرے دیں گے۔ گواہی ان بلبلوں پر واجب تھی اور بتیس سال بعد ان بلبلوں نے ہر بچن سنگھ سے یہ سچ اُگلوالیا کہ وہ ایک قاتل ہے اور اس نے اپنی بیوی کے سامنے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

''میرے سامنے کیا، میرے ہاتھوں سے مرا تھا وہ۔ ہیں!! بڑھیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہر بچن سیا، تیئں بندہ مارا تھا۔ او، وقت وقت کی بات ہے۔ تُو تو جھلی ہے میں جیسے اب ہو گیا ہوں ہمیش ایسا تھوڑی تھا۔ بھول ہو گئی تو! اب طعنے دیتی ہے۔ آزاد بندوں کے۔۔۔ تو چھوڑ اس قصے کو اب، چلم بھر کے لا، ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ دیکھ تو بارش کیسے ہو رہی ہے۔ ویسے ہی بلبلے ہیں۔ کملا کہتا تھا یہ گواہی دیں گے۔ پوچھ ان سے کدھر دی گواہی۔ بتیس سال گزر گئے بتیس سال سے لالہ اسی طرح مرتے وقت کی آنکھیں نکال کے ان بلبلوں میں اچھلتا آیا ہے۔ کودتا آیا ہے۔''(۵۷)

جس دن ہر بچن سنگھ کو پھانسی ہوئی اس دن بھی کہتے ہیں کہ بہت زور کی بارش ہوئی، یوں بارش کے قطروں نے اپنا قرض ادا کر دیا۔ اسی طرح ابدال بیلا نے اپنے تخیل کے زور پر باب ''لال ہنیری'' سرخ طوفان میں خون پینے والی چڑیلوں کی موجودگی کے ذکر سے اساطیری ماحول کی جزئیات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

''لال انھیری پورے گاؤں کے آسمان پہ تنی کھڑی تھی۔ آسمان و زمین کے کونے کھدروں سے نکل نکل کے آئی ساری کریہہ منظر، ہیبت ناک چڑیلیں دانت نکوسے،

خون بھرے جبڑے ہلاتی اڑتی چلی جارہی تھیں۔افق کا سارا لال خون آندھی نے پی کے پورے آسمان پہ مل دیا تھا۔غبار مٹی ملی ہواؤں بیچ عجیب طرح کے خوف بھرے سناٹے کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔سارا ماحول لال نظر آرہا تھا۔۔کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس آندھی میں چھپی چڑیلوں نے اپنا شکار تاڑ لیا ہے۔یہ بات ان دنوں طے تھی کہ لال آندھی میں چڑیلیں بھاگتی دوڑتی پھرتی ہیں۔شکار کرتی ہیں۔خون پیتی ہیں۔"(۵۸)

ابوالفضل کے چھوٹے بھائی کو ایک سکھ لڑکی ہربنس کور سے محبت ہو گئی۔صدر نے ہربنس کور کو حاصل کرنے کے لیے چلہ کیا۔چلے کے دوران صدر کو پُراسرار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ابدال بیلا نے اپنے فن کا کمال دکھاتے ہوئے قاری کے تخیل کو ایسے اساطیری جہان کی سیر کے لیے روانہ کیا جہاں ہر طرف ڈر اور خوف پھیلا ہوا تھا۔

"سکوت خوف ناک ہو گیا۔کسی کے جبڑے میں اپنا خون رستا ہوا صدر دین کو محسوس ہونے لگا۔اچانک ایک زور کا دھماکا ہوا۔اتنے زور کا کہ صدر کو لگا کہ اوپر چھت کا شہتیر ٹوٹ گیا ہے۔سر کے اوپر جیسے کوئی بم پھٹا ہے۔تڑاخ کی ایسی آواز آئی کہ جیسے دانتوں میں لیے کسی نوالے کی سخت ہڈی ٹوٹی ہو۔سر سے پاؤں تک اس کی بوٹی بوٹی ہل گئی۔گردن گھما کے اوپر دیکھا تو واقعی ہی چھت ٹوٹی ہوئی تھی۔آسمان پہ تارے تھے۔اچانک ٹوٹی ہوئی چھت پہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لمبی چوڑی لاش آکے معلق ہو گئی۔انسانی جسم سے دوگنا جسم، بازو، ٹانگیں، پورا دھڑ مگر گردن کٹی ہوئی، سر غائب، تڑپتی ہوئی لاش، ایک لمحہ وہ اوپر نظر آئی اور دوسرے ہی لمحے دھڑام سے نیچے فرش پہ گر پڑی۔پہلے سے بھی بڑا دھماکا ہوا۔بھونچال آگیا۔صدر کے پیروں کے آگے فرش پہ لاش بغیر سر کے تڑپ رہی تھی۔کوئی بارہ فٹ لمبی لاش، کٹی گردن سے خون جھٹکوں سے ابل رہا تھا۔"(۵۹)

صدر کو سادھو نے جنات کا اسم پڑھنے کے لیے دیا تھا۔سائیں نے اس اسم کے اثرات زائل کرنے کے لیے صدر کا بستر اپنے ڈیرے کے احاطے میں لگوایا اور کچھ پڑھ کر ساری جگہ کیل دی۔صدر کو اس موقع پر مافوق الفطرت حالات سے واسطہ پڑا۔

''کبھی دن چڑھ جاتا، کبھی رات ہو جاتی، کبھی سامنے آ کے ایک کوا بولنے لگتا۔ بارش شروع ہو گئی بھونچال بھی آیا۔آخر وہ گردن کٹا جن خود آگیا۔ گردن کے بغیر جو مسجد کی چھت سے گرا تھا۔اس وقت اس کے اوپر اس کا سر بھی تھا۔آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ سانسوں سے کالے ریل کے انجن کی سی بھاپ۔ درخت جتنا اونچا۔ایک ایک قدم سے اس کے زمین ہلے۔''(۶۰)

اساطیر کا تنوع ادب کو ایک نئے جہانِ معنی سے روشناس کراتا ہے۔اساطیری جہات دنیا کے ادب کا لازمی حصہ ہیں۔اساطیر، عصری صورتِ حال کے ساتھ مل کر آفاقی سچائیوں سے پردہ اُٹھاتی ہیں۔ابدال بیلا نے اپنے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں بھی ایک اساطیری دنیا کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔آپ نے اپنے تخیل کی کارفرمائی سے زمان و مکان کے بُعد سے پردہ اُٹھایا۔ نیز اساطیری کرداروں کے ذکر اور ماورائی واقعات کی مدد سے اپنی تحریر کو مابعد الطبیعیاتی رنگ دے کر اساطیر سے تعلق قائم کرنے کی سعی کی ہے۔ابدال بیلا کو یہ کمال حاصل ہے کہ قاری اس کے ساتھ کسی بھی جہان کی سیر کرتے ہوئے اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔آپ اساطیری کرداروں کے ذکر سے قاری کو اساطیری روایات سے متعارف کرواتے ہیں، ڈر، خوف اور دہشت کی فضا قائم کرتے ہیں، امید و رجا کے پہلو سامنے لاتے ہیں، جادو ٹونے، اور مافوق الفطرت واقعات سے قاری کے تخیل کو بلند پروازی عطا کرتے ہیں، سوچنے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں نیز حال اور ماضی کو آپس میں جوڑتے ہوئے آفاقی صداقتوں سے پردہ اُٹھاتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عبداللہ خان خویشگی (مؤلف)، فرہنگِ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۲۹

۲۔ اردو لغت (تاریخی اُصولوں پر)، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۴۲۴

۳۔ وارث سرہندی ایم اے، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۷۷۴

۴۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلیکیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء ص ۱۰۵

۵۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۴

۶۔ ابوالاعجاز صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲۴۰

۷۔ قاضی عابد حسین، اُردو افسانے میں اساطیری علامات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱

۸۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد الرحمٰن (مرتبین)، منتخب ادبی اصطلاحات، ۲۰۰۵ء، سویرا آرٹ پریس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۰۔۱۳۹

۹۔ ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۶۔۳۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۲۴۔۲۲۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۴۔۹۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۰۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۱۲۔۳۱۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۳۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۷۹

۲۳۔ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۰۰

۲۴۔ایضاً، ص ۴۰۶

۲۵۔ایضاً، ص ۴۰۷

۲۶۔ایضاً، ص ۸۴۹

۲۷۔ایضاً، ص ۱۴۰۳

۲۸۔ایضاً، ص ۱۴۳۸

۲۹۔ایضاً، ص ۱۵۰۳

۳۰۔ایضاً، ص ۱۵۰۱

۳۱۔ایضاً، ص ۱۵۰۰

۳۲۔ایضاً، ص ۱۱۳

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ایضاً، ص ۲۶۴

۳۵۔ایضاً، ص ۳۰۲

۳۶۔ایضاً، ص ۳۳۹

۳۷۔ایضاً، ص ۶۳۷

۳۸۔ایضاً، ص ۶۸۵

۳۹۔ایضاً، ص ۶۸۸

۴۰۔ایضاً، ص ۴۹۷

۴۱۔ایضاً، ص ۶۵۲

۴۲۔ایضاً، ص ۷۱۰

۴۳۔ایضاً، ص ۸۴۴

۴۴۔ایضاً، ص ۱۱۸

۴۵۔ایضاً، ص ۱۳۰۷

۴۶۔ایضاً، ص ۱۳۱۸

۴۷۔ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۰۔۳۹

۴۸۔ایضاً، ص ۵۹

۴۹۔ایضاً، ص ۱۲۹۔۱۲۸

۵۰۔ایضاً، ص ۶۲۹

۵۱۔ایضاً، ص ۷۰۳

۵۲۔ایضاً، ص ۶۴۷

۵۳۔ایضاً، ص ۶۸۰

۵۴۔ایضاً، ص ۷۱۳۔۷۱۲

۵۵۔ایضاً، ص ۷۱۱

۵۶۔ایضاً، ص ۷۴۲

۵۷۔ایضاً، ص ۹۸۸

۵۸۔ایضاً، ص ۹۹۵

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۰۳۷

۶۰۔ایضاً، ص ۱۰۴۳

باب چہارم

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

الف: مجموعی جائزہ:

ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔اس کی تحریریں نہ صرف اس کے عہد کے نظریات اور رجحانات کی عکاس ہوتی ہیں بلکہ حال کے آئینے میں ماضی کا عکس بھی پیش کرتی ہیں۔ادب، ادیب کی شخصیت کی جہات، اس کی فکر اور سوچ کا پرتو ہے۔اس کی ذات کی نقاب کشائی کرتا ہے۔اس کے جذبات وخیالات اور زندگی کے حقائق کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ ادیب ،ادب کے پردے میں اپنا گہرا مشاہدہ اور وارداتِ قلبی بیان کرتا ہے۔ایسے ہی ایک ادیب ابدال بیلا ہیں۔ جنھوں نے اپنی تحریروں کی مدد سے اپنے مشاہدے، تجربات، کیفیات اور حالات وواقعات قاری تک پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ آپ ادبی دنیا میں بحیثیت افسانہ نگار متعارف ہوئے۔اس کے بعد آپ کی شخصیت کے دیگر پہلو سامنے آئے۔آپ نے افسانہ نگار کے علاوہ بطور شخصیت نگار، کالم نگار، ناول نگار اور سیرت نگار اپنا لوہا منوایا۔ نیز شاعری، رپورتاژ اور سفر نامے کی میدان میں بھی قلم آزمائی کی اور ہمہ جہت ادبی شخصیت ہونے کا ثبوت دیا۔

بطور ناول نگار آپ کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' اپنے اندر ایک مابعد الطبیعیاتی دنیا آباد کیے ہوئے ہے۔یہ ناول ایک طرح کی آپ بیتی ہے جو ابدال بیلا نے اپنے جنم لینے سے دو صدیاں پہلے بیت لی ہے۔یہ ''میں'' سے ''تم''تک پہنچنے کے سفر کی داستان ہے۔جو بالآخر اپنی ''میں'' سے رہائی کے بعد ''تم'' کے نور میں فنا ہونے پر ختم ہوتی ہے۔ ''میں'' سے ''تم''تک کے اس سفر میں ابدال بیلا نے جن جن کہانیوں کو بیتا، ان کو ہو بہو قاری تک پہنچایا۔ صدیوں کے اس سفر میں زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر جن پُر اسرار مظاہر، روحانی اور باطنی مشاہدات اور مافوق الفطرت عناصر سے آپ کا واسطہ پڑا۔آپ نے بہت خوبصورت اور آسان پیرائے میں انہیں بیان کیا۔آپ کا زندگی کے بارے میں عمیق مشاہدہ مابعد الطبیعیاتی روش اختیار کیے ہوئے ہے۔آپ تصوف کے مابعد الطبیعیاتی پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تصوف وجدان کے ذریعے حق کا مشاہدہ ہے اور تصوف کی دنیا تک رسائی کامل اخلاق کے ذریعے ممکن ہے۔ بہترین انسانی معاشرے اور انسانی زندگی کی تعمیر اخلاقی اقدار کے بغیر ممکن نہیں ہے چنانچہ تزکیہ نفس پر زور دیتے ہوئے اخلاقی اقدار کو زندگیوں کا حصہ بنایا جائے۔اس کے

ساتھ ہی آپ قاری کو اساطیری دنیا کی سیر کراتے ہیں۔ جہاں اسے حیرت، اسرار، تحیر، ڈر اور خوف کے سائے بھی نظر آتے ہیں، اساطیری کرداروں سے ملنے کی خوشی بھی ملتی ہے۔ نیز اساطیری فضا کے سحر میں گم ہونے کے ساتھ ساتھ اساطیری واقعات کے پسِ پردہ موجود کہانیوں اور بھید سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔

ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' پر جن مابعد الطبیعیاتی عناصر کی گہری چھاپ موجود ہے ان میں ایک عنصر تصوف ہے۔ تصوف تطہیرِ قلب اور تزکیہ نفس کے ذریعے خدا تک پہنچنے کا راستا ہے۔ ابدال بیلا نے تصوف کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں یہ رمز آشکار کرنے کی کوشش کی ہے کہ معرفتِ الٰہی اور محبتِ الٰہی انسان کی زندگی کو بدل دیتی ہے۔ انسان کا ہر کام خالص اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ کو اپنی مخلوق سے بہت محبت ہے چنانچہ جو رب سے محبت کرتا ہے وہ اس کی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ گناہ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ وہ ہر لمحہ ہجر کی آگ میں جلتا اور وصل کا خواہش مند ہوتا ہے۔ عشق کی آگ اس کا وجود جھلسا دیتی ہے۔ جب اس سچی تڑپ اور لگن کے صدقے انسان کو اس کی محبت مل جاتی ہے تو وہ باقی دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ابدال بیلا عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کے سفر کے بھید کو بیان کرتے ہیں کہ اپنے چاہنے والوں کا انتخاب اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اس کی منشا ہے وہ جسے بھی چُن لے اور اپنی محبت کا سوز بخش دے۔ انسان اس معاملے میں لاچار ہے۔ وہ جب چاہتا ہے انسان اپنا سب کچھ تیاگ کر اس کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ وہ جسے اپنانا چاہتا ہے اس کے ہر راستے کا رُخ اپنی طرف پھیر دیتا ہے۔ ابدال بیلا باطنی مشاہدے کو خارج کے ساتھ ملاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کی تکالیف اور دکھ درد کا علاج اس ہستی کی محبت میں پوشیدہ ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والی ذات انسان کو ہمہ وقت اپنانے کے لیے تیار رہتی ہے۔ انسان جب دنیا کے رنج و غم سے گھبرا کر اسے پکارتا اور اس کا در کھٹکھٹاتا ہے تو وہ فوراً اپنا دروازہ کھول دیتا ہے۔ جب روح مجاز کی محبت اور جدائی میں بے کل ہو کر روتی اور تڑپتی ہے تو ربِ کریم کی رحمت اس روح کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے اپنی محبت سونپ دیتی ہے۔

بیلا نے صوفیانہ افکار و نظریات کا پرچار کرتے ہوئے ہمارا دھیان اس مابعد الطبیعیاتی اسرار کی طرف دلایا ہے کہ جب انسان اللہ کی محبت کی بھٹی میں تپ کر کندن بنتا ہے تو اس کے باطن کی آنکھ روشن ہو جاتی ہے۔ فاصلے سمٹ جاتے ہیں، نگاہ ہر حد کو پار کرتے ہوئے لمحوں میں فاصلوں کی خبر لے آتی ہے، زمان و مکاں کی حد بندیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں، من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے، یقین کی پختگی عطا ہوتی ہے، ہر سُو جلوہ یار نظر آتا

ہے اور انسان اس کی محبت اور عشق میں ڈوب کر اپنا سراغ پالیتا ہے اور مقصدِ زندگی سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

ابدال بیلا نے وجدان اور ایقان کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے ہمارا دھیان کائناتی سچائی کی طرف دلایا ہے کہ اللہ پاک کی ذات ہر شے کی اکیلی مالک ہے۔ کائنات کا سارا نظام اس کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہِل سکتا۔ کائنات جن قوانین کے تابع ہے۔ اس میں ترمیم اور ردو بدل کا اختیار صرف اور صرف اسی کے پاس ہے۔ کائنات سے جو ہر لحہ کن فیکون کی صدا آرہی ہے اس کی رضا اور منشا سے آرہی ہے۔ انسان کی تقدیر لکھنے والا وہ خود ہے۔ جو کہانیاں اس دنیا میں بِتائی جارہی ہیں ان کے کردار، حالات وواقعات، مقام سب پہلے سے طے شدہ ہیں۔ انسان اپنی مرضی سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ ہم کیا ہیں، کیا نہیں ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ اس سب کا علم صرف اسی کی ذات کو ہے۔ وہ اپنی ذات میں یکتا اور یگانہ ہے۔

ابدال بیلا روحانی اور باطنی حوالے سے روحانی اُمور میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدے کے بل پر اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ روحانی اور باطنی ترقی وردو وظائف کے مرہونِ منت ہے۔ مختلف اوراد خاص طور پر کلمہ طیبہ اور درود پاک تطہیرِ نفس کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان وظائف کے ورد سے باطن مصفا ہوتا ہے، روحانیت کے دروازے کھلتے ہیں، فقر عطا ہوتا ہے اور دل نور سے بھر جاتا ہے۔ کلمہ طیبہ روح اور قلب کو منور کرتا ہے۔ لا سے لا الہ اور پھر محمد الرسول اللہ کا سفر بِلا تفریق وامتیاز پڑھنے والے کے مشامِ جاں کو معطر اور باطن کو منور کرتا ہے۔ جب انسان کے جسم میں کلمہ طیبہ سرایت کر جاتا ہے تو اس پر ہر طرح کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ کلمہ طیبہ اور درود پاک کی بدولت قلب تجلیاتِ الٰہی کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس پر ظاہر و باطن کے تمام بھید کھل جاتے ہیں اور کائنات کے تمام اسرار اس پر آشکار ہو جاتے ہیں۔ یوں انسان نیابتِ الٰہی کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

ابدال بیلا کے نزدیک یقین کی منزل اور وارداتِ قلبی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے وجود میں موجود اپنے سب سے بڑے دشمن کا سر کچلے اور اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے اپنی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ روحانی دنیا میں انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی ''میں'' ہے۔ جب تک اس میں ''میں'' ہے وہ ''تُو'' تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان کی ''میں'' اس کے نفس کو سرکش بناتی ہے اور انسان نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔ گویا تصوف کی راہ پر چلنے اور معرفتِ الٰہی کے لیے ضروری ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنی ''میں'' کو ختم کرے۔ معرفتِ الٰہی اسی کو نصیب ہوتی ہے اور کائنات کے بھید اسی پر کھلتے ہیں جو اپنی ''میں'' کے

محل کو گرا کر اپنا خالی اور خالص دل اُس کی محبت کے حوالے کر دیتا ہے۔ ربِ کریم اس خالی پن کو اپنی محبت سے بھر کے قلب کو سوز عطا کرتا ہے۔

ابدال بیلا نے خوب صورت انداز میں اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ اللہ سے لو لگانے والے اور اپنے نفس پر قابو پانے والے کو اللہ پاک طاقت عطا کرتا ہے۔ مگر یہ طاقت بھی ایک طرح کا امتحان ہے کہ آیا انسان میں اتنا ظرف ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی اس امانت کا درست طریقے سے استعمال کرتا ہے یا نہیں۔ کیا زندگی کے کسی مرحلے پر اس کے اندر موجود شر غالب آتا ہے یا خیر کی قوتیں فاتح ٹھہرتی ہیں۔ ابدال بیلا نے اس رمز کے پردے میں انسانی سرشت میں موجود خیر و شر کے عنصر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ خیر و شر کے درمیان جنگ ازل سے جاری ہے۔ انسانی وجود خیر و شر کا پیکر ہے۔ اگر خیر، شر پر غالب آجائے تو انسان فرشتوں کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور اگر شر کا مادہ غالب آجائے تو انسان مخلوقِ خدا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں اس سے اس کی ساری طاقت اس سے چھین لی جاتی ہے۔

صوفیانہ عناصر میں ایک مابعد الطبیعیاتی عنصر کشف ہے۔ ابدال بیلا نے لطیف اور دلکش پیرائے میں اس امر کی عکاسی کی ہے کہ جب انسان کے من میں رب کی محبت کی لو لگتی ہے تو وہ تطہیرِ نفس کے ذریعے تمام برے اخلاق سے چھٹکارہ پالیتا ہے۔ محبت اور لگن سچی ہو تو رب کے مہربان ہوتے دیر نہیں لگتی۔ رب جب مہربان ہوتا ہے تو بصیرت عطا کرتا ہے۔ قلب کو بینائی ملتی ہے اور انسان آنے والے حالات سے باخبر ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیات روح پر وارد ہوتی ہیں اور روح کی آنکھ غیب کے خبریں اور مناظر دکھاتی ہے۔ وہ ہونیاں جو مستقبل میں ہونی ہیں ساری حال میں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ گویا جب ''میں'' کو ''تُو'' مل جاتا ہے تو اس کی نگاہ کے سامنے سے سارے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔

صوفیانہ عناصر کے علاوہ ابدال بیلا نے ''دروازہ کھلتا ہے'' میں اساطیری جہات کو بطور مابعد الطبیعیاتی عنصر خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اساطیری جہات کے تناظر میں آپ نے قاری کو اساطیری کرداروں سے متعارف کرواتے ہوئے اس کا تعلق اس کے لاشعور سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مافوق الفطرت عناصر، محیر العقول واقعات، پُراسراریت اور جادو ٹونے کی مدد سے ابدال بیلا نے مابعد الطبیعیاتی مظاہر سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ انسان کا اساطیر سے بہت گہرا اور پرانا رشتا ہے۔ اساطیر کا نام سنتے ہی انسان کا تخیل اسے ان گزرے زمانوں کے سفر پر لے جاتا ہے۔ جب اس نے سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کی ابتدا کی تھی۔

ابدال بیلا نے ناول کے کرداروں کے پسِ منظر میں اساطیری کرداروں کے حسن و جمال کو بیان کیا ہے۔ نیز مختلف اساطیری علائم کے استعمال سے ناول میں اساطیری فضا پیدا کی ہے۔ مختلف علائم اور اساطیری کرداروں کا ذکر قاری کے تخیل کو پرواز عطا کرتا ہے اور وہ خود کو اساطیری عہد کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ یوں ابدال بیلا نے ماضی اور حال میں تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' میں جن اساطیری کرداروں کا ذکر ہے وہ مافوق الفطرت مہمات اور کارنامے انجام دیتے ہیں اور ان کی ذات سے ماورائے عقل واقعات منسوب ہیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ایک عام انسان کے مقابلے میں غیر مرئی قوتیں رکھتے ہیں اور ان قوتوں کی مدد سے وہ اپنے دشمن پر قابو پاتے ہیں۔ ناول میں دیومالائی کہانیوں کی مدد سے ایک اساطیری جہان کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ مہابھارت کا ذکر اور دہلی شہر کی آبادکاری کا واقعہ اس کی عمدہ مثال ہے۔

ابدال بیلا تناسخ اور آواگون کے تذکرے سے مابعد الطبیعیاتی فکر کو سامنے لاتے ہیں۔ روح کی کرموں کی بنا پر ایک قالب سے دوسرے قالب میں تبدیلی صدیوں سے ہندی اساطیری روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔ اساطیر کی مدد سے ابدال بیلا نے ثقافتی اور تہذیبی عناصر کی منظر کشی کی ہے اور ماضی کی بازیافت عمل میں آئی ہے۔ تحیر، خوف اور ڈر اہم اساطیری عناصر ہیں۔ اندھیرے، ویران جگہوں اور ارواح کے ذکر کی مدد بھی سے اساطیری فضا کی عکاسی کی گئی ہے۔ ابدال بیلا نے اس اساطیری پہلو سے بھی نقاب اُٹھانے کی سعی کی ہے کہ جادو انسان کی جون اور ہیئت میں تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے نیز جن اور چڑیلیں انسانی زندگی میں غیر مرئی مخلوق کی صورت میں اپنا اپنا کردار نبھا رہی ہیں۔

ابدال بیلا موسیٰؑ، شیرِ خدا، آئمہ کرام وغیرہ کے ذکر سے اسلامی اساطیری دنیا کا ایک پہلو بھی سامنے لائے ہیں۔ نیز سنیاسی، جوگی، مردِ قلندر، خوابوں، چلہ کشی اور بددعا کے اثرات وغیرہ کی مدد سے بھی اساطیر فہمی کی روایت کی ترجمانی کی کوشش کی گئی ہے۔ ابدال بیلا اپنے تخیل کے زور سے ایک ایسی ساطیری دنیا کو سامنے لائے ہیں جو آفاقی صداقتوں کی امین اور زماں و مکاں کا بُعد ختم کر کے ماضی کو حال کے ساتھ ملانے کے لیے کوشاں ہے۔

اگر ہم اساطیر کے حوالے سے جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ حال میں موجود اساطیر ہمارے ماضی میں وقوع پذیر ہوئیں جب کہ حال میں وقوع پذیر ہونے والے ماورائی اور خلافِ عقل واقعات مستقبل کی

اساطیر کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ ہر عہد اور ہر دور میں اساطیر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ظلم اور جبر کے دور میں ادیب نے علائم اور اساطیر کے پردے میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی جرات کی۔ ابدال بیلا نے بھی اساطیر شناسی کی روایت کے حوالے سے ادب میں حصہ ڈالنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ آپ نے اپنے تخیل کی بلند پروازی کے ذریعے اپنے ناول میں ایک اساطیری رنگ اور جہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

مختصر یہ کہ ابدال بیلا نے بحیثیت ناول نگار اپنے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کا ایک جہان آباد کیا ہے۔ آپ نے صوفیانہ عناصر کی مدد سے قاری کو اخلاقی اقدار اپنانے کی طرف مائل کرنے نیز اللہ سے محبت کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کا درس دینے کی کوشش کی ہے اور اساطیری عناصر کی مدد سے قاری کا تعلق اس کے ماضی سے جوڑنے نیز ماورائے عقل اور حیرت انگیز واقعات کی مدد سے اس کو ایک تخیلاتی جہان سے متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج

ابدال بیلا کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کے جائزے کے لیے کی جانے والی تحقیق کے دوران سامنے آنے والے نتائج کچھ اس طرح ہیں۔

ا۔ ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' میں مابعد الطبیعیاتی عناصر موجود ہیں، جو مصنف کی فلسفیانہ فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار ''میں'' اور ''تم'' ہیں۔ ''میں''، ''تم'' کو اپنے آباواجداد کی کہانیاں سناتا ہے اور ان کہانیوں کے اندر کرداروں پر بیتنے والے واقعات مابعد الطبیعیاتی جہتوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔

۲۔ ابدال بیلا ''میں'' اور ''تم'' کی گفتگو میں مابعد الطبیعیاتی عناصر کی ذیل میں صوفیانہ مباحث کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ محبت اور عشق کی بات کرتے ہوئے مجاز سے حقیقت کا سفر کرواتے ہیں۔ معرفتِ الٰہی، عرفانِ ذات، قوانینِ کائنات میں ردوبدل، خیر و شر کی آویزش، کشف اور ورد و وظائف کے ذریعے کھلنے والے بھید ظاہر کرتے ہیں۔

۳۔ ''تم'' سے فراق اور بے اعتنائیوں کے شکوے بیان کرتی یہ گفتگو آخر میں اس راز کو فاش کرتی ہے کہ جب کسی ذی نفس کے دیے گئے گھاؤ روح کو چھلنی چھلنی کر دیں تو اس درد اور تکلیف کی شدت سے بلند ہونے والی چیخ

ربِ کریم کے دروازے تک جا پہنچتی ہے اور وہ دروازہ کھول کر گلے لگالیتا ہے۔

۴۔ مافوق الفطرت اور پُراسرار واقعات کے ذریعے ابدال بیلا نے قاری کے تخیل کو عام سطح سے بلند کرنے نیز اسے مابعد الطبیعیاتی آفاقی سچائیوں سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ اسلامی اور مشرقی اساطیری روایات سے متعارف کرانے کی سعی کی ہے۔ اساطیری کرداروں کے ذریعے ماضی کے قصے کہانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ نے جادو ٹونہ اور کئی پُراسرار و پُر تحیر واقعات کی مدد سے قاری کی فکر کو متاثر کیا ہے۔

ج۔ سفارشات:

۱۔ زیرِ تحقیق مقالے میں ''دروازہ کھلتا ہے'' کا مابعد الطبیعیاتی حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم ناول کا تاریخی حوالے سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

۲۔ ناول کے فنی، فکری اور اسلوبی مطالعے کو موضوعِ تحقیق بنایا جاسکتا ہے۔

۳۔ ناول میں موجود تہذیبی اور ثقافتی عناصر کے حوالے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

الف۔بنیادی ماخذ

ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

ب۔ثانوی ماخذات

i۔کتب

ابدال بیلا، انہونیاں، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء

ابدال بیلا، رنگ پچکاری، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء

ابوالاعجاز صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اُسلوب اردو، لاہور، ۲۰۱۵ء

ابوالاعجاز صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

اکبر لغاری، فلسفے کی مختصر تاریخ (اشاعت دوم)، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء

القرآن، احمد رضا خان، مترجم، مکتبہ المدینہ، کراچی، ۲۰۱۷ء

انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

انور سجاد، خوشیوں کا باغ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۳ء

بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء

جلال الدین رومی، مولانا، مثنوی مولانا روم، مترجمہ محمد عالم امیری، دارالعلوم جامعہ ایوبیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء

جمیلہ ہاشمی، دشتِ سُوس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

حبیب حق، کلاسیکی یونان تہذیب فلسفہ فنون لطیفہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

راحیلہ لطیف، اردو ناول میں مابعد الطبیعیاتی عناصر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۸ء

رضا حیدر، ڈاکٹر، اردو شاعری میں تصوف اور روحانی اقدار، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد الرحمٰن (مرتبین)، منتخب ادبی اصطلاحات، ۲۰۰۵ء، سویرا آرٹ پریس، لاہور، ۲۰۰۵ء

شبلی نعمانی، علامہ، الغزالی، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء
شیخ قطب الدین دمشقی، امداد السلوک، مؤلفہ رشید احمد گنگوہی،، دار الکتاب دیوبند، یو۔پی، ۲۰۰۵ء
شیو موہن لعل ماتھر، قدیم ہندی فلسفہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی ہلی، ۱۹۹۸ء
عبد الکریم ہوازی قشیری، رسالہ قشیریہ، مترجمہ محمد وسیم اکرم القادری، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۱۲ء
علی بن عثمان ہجویری، سید، کشف المحجوب، مترجمہ فضل الدین گوہر، ضیاالرحمٰن بپلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء
قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹
محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلیکیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء
محمد حفیظ، ڈاکٹر، گوتم بدھ زندگی اور افکار، آزاد انٹر پرائزرز، لاہور، س
محمد کاظم، مسلم فکر و فلسفہ، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۸ء
محمد یحیٰی خان، پیار نگ کالا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء
محمد یحیٰی خان، من مندر، من مسجد، حماد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
محمود علی انجم، پروفیسر، نورِ عرفان اسلامی تصوف (مابعد الطبیعیات) کا تحقیقی، مشاہداتی اور تجرباتی جائزہ، جلد اول، س
مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر، جدید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء
ممتاز مفتی، الکھ نگری، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۶ء
واصف علی واصف، واصفیات، کاشف پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

ii۔ لغات/فرہنگ

احمد دہلوی، سید، فرہنگِ آصفیہ، ترقی اردو بیور، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء
اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ۱۹۷۷ء
محمد اسحاق جلالپوری، تاج محمد (مرتبین) درسی لغت، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء
شمس الرحمان فاروقی، لغاتِ روزمرہ (تیسرا اضافہ و تصحیح شدہ ایڈیشن)، انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۱ء
فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات اردو جامع، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء
محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۷ء

محمد اکرم چغتائی، تشریحی لغت، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۱ء

نجیب رام پوری، نئی اردو لغت (جامع)، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

وارث سرہندی ایم اے، علمی اردو لغت (جامع)، سردار محمد پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۹ء

A,R.Lacy, A dictionary of philosophy, published by Routledge,11 New fetter lane, London ,1996,

iii۔انسائیکلوپیڈیا

ابوالقاسم ابوالکریم ہوازن قشیری، تصوف کا انسائیکلوپیڈیا، مترجمہ محمد عبدالنصیر بن عبدالبصیر، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س

فضل الرحمٰن، پروفیسر، اُردو انسائیکلوپیڈیا (جلد سوم)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء

یاسر جواد، فلسفیوں کا انسائیکلوپیڈیا، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۵ء

The New encyclopedia Britinnica, USA,vol 24,1985

iv۔جرنل

Frederick Sentage, Mythical Thought and Metaphysical Language , The Journal of Relegion, Vol 41,No.2, The University of Shicago Press, 1961,

v۔غیر مطبوعہ مقالہ جات

محمد نوید ازہر، پاکستانی غزل میں ما بعد الطبیعیاتی عناصر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء (غیر مطبوعہ، مقالہ)

v۔ویب گاہیں

۱۱:۳۴am,http://www.dictionary.com

۱۱:۲۴am, https://dictionary.cambridge.org/

v۔انٹرویو

ابدال بیلا سے مقالہ نگار کا انٹرویو، اسلام آباد، ۱۴ر فروری ۲۰۱۸ء، بوقت ۳ بجے دن، بروز بدھ

کیول دھیر سے مقالہ نگار کا انٹرویو، بذریعہ ٹیلی فون، ۲۶ر جون ۲۰۱۹ء بوقت ۱۱ بجے دن، بروز بدھ